Wahshi Mehmood
Gulraiz-e-Yaman
Abad

Lala
Roohi

تعارف

ایک غیر معروف مصنف کی پہلی تصنیف بہرحال محتاج تعارف ہے اور کسی مایۂ ناز ہستی کے نام سے منسوب ہونے کی منتظر ہے۔ رواجاً میرے دل میں کئی بار یہ خیال پیدا ہوا کہ دنیائے ادب میں اپنے باضابطہ داخلہ کا پروانہ کسی معیاری ادیب سے حاصل کروں۔ اس سلسلہ میں متعدد نقشے ذہن میں آئے اور نکل گئے۔ جواد زیدی صاحب کے نام پر خیال نے قدرے قرار لیا۔ مگر طبعی خودداری نے پیر جمنے نہ دیئے۔ ذہنی کشمکش میں عقل سلیم کا فیصلہ یہی ہوا کہ "تصنیف خود تعارف کی ضمانت دار ہے"! اب رہا کسی قابل قدر شخصیت سے نسبت دینے کا سوال۔ تو میرے دل میں خود یہی ارمان تھا کہ اپنی پہلی کتاب حضرت آقائی محمد امیر احمد خاں مدظلہ العالی کے اسم گرامی سے معنون کروں اور ذات جلالت مآب کے نام کی برکتوں سے مستفیض ہوں لیکن ناولٹ اور اس کی کم مائگی کو دیکھ کر عقیدہ مند دل نے گوارا نہ کیا کہ اپنے ساتھ اپنے ولی نعمت کو بھی رسوا کروں۔

سامعین کرام اس طویل افسانے کو ملاحظہ فرما کر مصنف پر یہ اعتراض وارد کریں گے کہ اُس نے اتنے بڑے پلاٹ کو ایسے مختصر خاکے میں کھپانے کی کوشش کی ہے کہ کہیں کہیں ربط واقعات کے لئے

غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اس خامی کا اعتراف ہے اور اُفتادِ طبیعت کے لحاظ سے میں اس اختصار پر معذور ہوں۔ یہ خیال بھی پیشِ نظر ہے کہ آٹھ سال کی تصنیف خدا خدا کر کے کتابی جامہ پہننے کے قابل ہو رہی ہے۔ تو اس کی ضخامت راستہ کا روڑا نہ بن جائے اور بے جا طوالت طبیعتوں پر بار نہ ہو جائے۔ علاوہ بریں دیگر نقائص جو میری نگاہوں سے دور ہیں۔ اگر مجھے توجہ دلائی گئی تو اگلی اشاعت میں اُن کے ازالہ کی کوشش کروں گا۔

انتہائی بد اخلاقی ہوگی۔ اگر میں حبیبم عزیزم محمد علی صاحب منیجر تنظیم پریس اور محمد جعفر صاحب منظر کی مساعی جمیلہ کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی کاوشوں کی بدولت ناچیز تصنیف منظر عام پر آسکی

خادم ادب
وحنی محمود آبادی

(اصغر حسن) تنظیم پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی

قیمت عہ ۸

گلزارِ یمن

باب ۱

آج اس کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار نمایاں تھے۔ گر وہ پانی میں پیر لٹکائے ہوئے موجوں کے لطیف ہچکولوں کا لطف لے رہا تھا۔ اور مغرب کی سرخ چادروں کی چھاؤں میں چمکتے ہوئے ذرّوں اور دریا کے سپاٹ کناروں سے جی بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سکریٹری ہونے کا اعزازی سہرا سر پر مزین لیکن نظروں میں الکشن کے ہنگامے گردش کر رہے تھے اور شکست خوردہ "عالم" کے الفاظ حافظہ میں گونج رہے تھے: "سکریٹری ہونا آسان ہے مگر میری توہین کی قیمت ادا کرنا دشوار ہوگا۔" وہ سوچ رہا تھا "جمال! میں ایک غریب اور مفلس طالب علم۔ ٹیوشن پر بسر اوقات و تعلیم کا دارومدار اگر عالم نے اپنے تموّل کے زعم میں کوئی انتقامی کارروائی کی، تو وطن سے

سیکڑوں میل دور میری امداد کرنے والا کون ہے؟ اور وطن قریب ہوتا بھی تو کیا؟ ہاں باپ حیات نہیں۔ بزرگوں میں صرف چچا کا دم ہے وہ بھی ضعیفی اور تنگدستی سے مجبور۔ اقربا کام آنے والے ہوتے تو گھر بار چھوڑکر تن تنہا دس سال پہلے ایسے دور اُفتادہ شہر میں آنا ہی کیوں پڑتا انھیں خیال اُلجھنوں میں کسی عورت کے چیخنے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی گردن گھما کر ادھر اُدھر اُس نے دیکھا مگر چاروں طرف رتیلے ساحل کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ سامعہ کو قصوروار سمجھ کر نگاہیں اوپر اُٹھائیں۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا روشنی کہنے کو باقی ضرور تھی مگر ایسی نہیں کہ دور کا آدمی پہچانا جا سکے۔ گھبرا کر وہ اُٹھا اور شہر کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔

ابھی مشکل سے ایک فرلانگ راستہ طے کیا ہوگا کہ ایک نشیب سے چپکے چپکے باتوں کی آہٹ محسوس ہوئی اس کے قدم خود بخود رک گئے مگر پھر کچھ سوچ کر وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ دیکھا کہ ایک عورت رسیوں سے جکڑی ہوئی پڑی ہے۔ دو آدمی اس کے برابر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور آپس میں کچھ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ جمال پر تھوڑی دیر کے لئے خوف غالب ہو گیا۔ اس کو تمام فرقہ وارانہ وردات یاد آگئیں جو آئے دن اُس کے سینے میں آتی رہی تھیں۔ اور جن کی درندگی اس کے دل میں بھی وقتی طور پر انتقامی جذبہ پیدا کر دیتی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میں ہموطنوں کی بہیمیت پر اس کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں اور وہ مادرِ وطن

کی بدقسمتی پر متاسف نظر آتا تھا۔ ہمت کر کے اس نے پھر اُن کی پوشاک پر نظر
ڈالی اور قرائن سے یہی رائے قائم کی کہ ڈو مسلمان کسی ہندو عورت کو دریا
میں ڈبو کر انتقام کے شعلوں کو بجھانا چاہتے ہیں۔ جمال بھی مسلمان تھا۔ تھوڑی
دیر کے لئے اس کی نیت ڈانواڈول ہو گئی مگر نفس کی بلندی آڑے آئی اور
وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"مظلوم کوئی بھی ہو امداد کا مستحق ہے۔ ایک بے دست و پا عورت پر
میری آنکھوں کے سامنے ظلم کیا جائے اور میں کچھ نہ کر سکوں"!۔

رگوں میں غیرت اور حمیت کا خون دوڑنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شیر
کی گرج کے ساتھ اس نے جست کی۔ فضا میں اس کی اسٹک بلند ہو گئی اور
ایک آدمی کا شانہ جھول گیا۔ اس نے بغیر لڑے بھڑے جان بچانا غنیمت سمجھا
ساتھی کے فرار پر دوسرے نے بھی دریا کے چھوڑان میں پناہ لی اور جمال
فاتحانہ شکوہ سے مسکراتا رہ گیا۔

آہستہ آہستہ وہ عورت کے قریب پہونچا۔ آسمان پر تارے نکلنے سے قبل
دریا کی ترائی میں چاند کا ایک ٹکڑا چمکتا دکھائی دیا۔ ہلکے سرمئی رنگ کی ساری ہی
زیب جسم تھی۔ سن تیرہ چودہ سال سے زائد معلوم نہیں ہوتا تھا مگر جوانی کے
آثار اُبھر چکے تھے۔ حسن و شباب کے نیم عریاں نظارے پر چند منٹ وہ سکتے
کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر جرأت کر کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ ہاتھ پیروں کی
رسیاں کھولیں اور دریا سے چلو میں پانی لے کر منہ پر چھینٹے دینا شروع کئے۔
لڑکی نے ہوش میں آکر پھر ایک چیخ ماری۔ مگر جمال نے اس کو تسلی دی اور کہا

—"خاتون! وہ بزدل بھاگ گئے۔ خوف نہ کیجئے۔ آپ محفوظ ہیں۔"
—لڑکی نے قدرے مطمئن ہو کر اس کو دیکھا اور ہاتھوں کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ مگر اس کی گھبراہٹ پھر بھی کم نہ ہوئی۔ وہ بار بار سہمی سہمی نظروں سے جمال کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر جمال نے پھر گفتگو کا آغاز کیا۔
—میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ حالات کے تحت ابھی تک خوف زدہ ہیں۔"
—اس کا جواب اس کو ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے دیا گیا۔ مگر اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔
—"ان بدمعاشوں نے آپ کو بہت تکلیف پہنچائی۔ خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ آئیے۔ رات زیادہ آچکی ہے اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔"
—یہ کہتا ہوا وہ اُٹھا اور حسین دوشیزہ بھی بلا ارادہ اُٹھ کر اس کے قدم بقدم چلنے لگی راستہ میں جمال نے پھر سوال کیا
—"یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ یہ لٹیرے آپ کو پا کیسے گئے؟"
—"میں سیر کر کے پلٹ رہی تھی۔ عالم بھائی بھی میرے ساتھ تھے۔ مگر وہ دوسرے راستہ سے کچھ دوستوں کے ہمراہ چلے گئے اور مجھے تنہا واپس ہونا پڑا۔ دریا کے کنارے یہ دونوں درختوں کی آڑ سے نکلے۔ مجھے پکڑ لیا اور کپڑا منھ میں ٹھونس دیا جس سے میں چلّا بھی نہ سکی۔ وہ تو کہئے خدا نے آپ کو بھیجدیا ورنہ خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا۔" لڑکی نے بدستور نظر نیچی رکھتے ہوئے جواب دیا۔
—عالم کے نام پر جمال کچھ چوکنا سا ہو گیا۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ دماغ میں سیکڑوں قسم کے خیالات گردش کرنے لگے۔

یہ دوشیزہ عالم کی بہن ہے۔ اس کو میرا حال معلوم ہو جائے تو یہ بھی خوبصورت ناگن کی طرح ڈسنے میں پس و پیش نہ کرے گی۔ مگر میں نے تو اس کی جان اور آبرو کی محافظت کی ہے۔ ایسا سلوک میرے ساتھ کیونکر ممکن ہے؟ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے بچنے کی کوشش کروں۔ ورنہ اس حادثہ کو جانے کس عنوان سے پیش کر دے صورت ایسی پائی ہے کہ کلیجے سے لگا لینے کے قابل۔ کاش یہ اس کی بہن نہ ہوتی"!

سوچتے سوچتے جمال نے اٹھلاتی ہوئی رفتار میں اس کی رعنائیوں کا جائزہ لیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر اپنے خیال میں ڈوب گیا۔ دوشیزہ کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ جمال کے وہی تغیرات کی اُسے کوئی خبر نہ ہو سکی۔ حتی کہ جب اس نے یاس انگیز نگاہ سے اس کے سراپا کو دیکھا تو بھی وہ کوئی اندازہ نہ کر سکی اور موت سے چھٹکارا پانے کے سرور میں برابر قدم اُٹھاتی رہی۔ سڑک پر پہنچ کر جمال نے ایک تانگے والے کو آواز دی اور دوشیزہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

——"آپ تانگے پر چلی جائیے۔ کہئے تو کچھ دور پہنچا دوں۔ مگر میرا راستہ دوسرا ہے"۔

——"اتنا ہی احسان نسیم کے لئے مدت العمر کو کافی ہے۔ مزید زحمت دینے کی جرأت کیسے کروں؟

——دوشیزہ نے تشکرانہ انداز میں جواب دیا۔ اتنے میں تانگہ قریب آگیا جمال نے سہارا دے کر اس کو تانگے پر بٹھا دیا اور درد محبت کی امتزاجی نظر سے

دیکھتا ہوا ایک طرف کو رد دانہ ہو گیا تانگہ بھی چلد دیا لیکن نسیم کو واقعات کی اُلجھنوں میں محسوس نہ ہو سکا۔ وہ خواب و خیال سے اس وقت چونکی جب جمال کسی راستہ پر غائب ہو چکا تھا۔ اس کے قلب پر ایک دھچکا سا لگا۔ چار سو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے دیکھا۔ مگر نگاہیں جمال کو ڈھونڈھنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ تانگہ پلٹا کر آنے جانے والی تمام راہوں پر تلاش کیا لیکن کوئی پتہ نہ چل سکا ہر طرح مجبور ہو کر حسّاس نسیم اپنے کو ملامت کرتی ہوئی واپس ہوئی اور راستہ بھر سوچتی رہی۔

"میں کتنی احسان فراموش ہوں کہ میں نے اپنے ملک صورت محسن کا نام اور پتہ بھی دریافت نہ کیا"
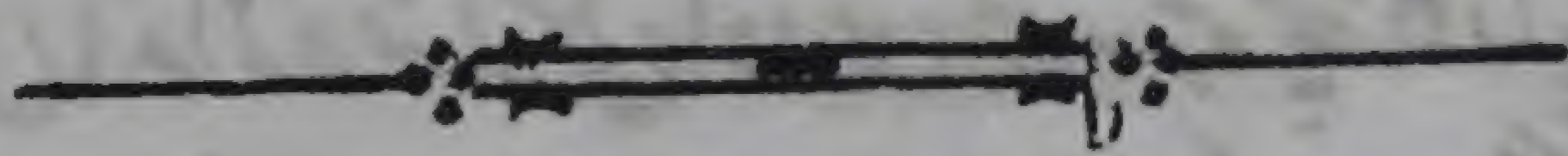
باب ۲

نسیم ایک پُرتکلف کمرے میں صوفے پر دراز تھی۔ دریا کے حادثہ کے بعد سے اس کی طبیعت روز بروز مضمحل ہوتی جارہی تھی۔ عالم نے ڈاکٹر کو بلاکر اس کا معائنہ بھی کرایا۔ مگر کوئی مرض تشخیص نہ ہوسکا۔ اس کی نوجوان خادمہ "سانولو" نے جی بہلانے کی کوشش کی لیکن چہرے پر شگفتگی پیدا نہ ہوسکی۔ بلکہ وہ تنہائی کو اور زیادہ پسند کرنے لگی۔ اس وقت بھی وہ سہ پہر کے ناشتہ سے فراغت کرکے دریا کے ہولناک واقعہ پر غور کررہی تھی۔ کسی رنگین خیال میں کبھی تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمایاں ہوجاتی اور کبھی افسردگی جھلکنے لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں اس نوجوان کے تابانی چہرے کی جویا تھیں جو ملک آسمانی بن کر اُترا اور اُسے نئی زندگی کا نوید دے کر دل میں میٹھی میٹھی کسک پیدا کرگیا "کتنا بھولاپن تھا اس کی باتوں میں کتنی سادگی تھی اس کی رفتار میں"؟ وہ آپ ہی آپ کہنے لگی "مگر دل نہیں۔ پتھر تھا اُس کے پاس۔ میری پریشانی پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ آنکھ جھپکی اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ مانا کہ اُس کو مجھ سے تعارف کی احتیاج نہ تھی۔ تاہم یہ استغنار بھی سوہان روح ہے کہ ایک رسمی بات تک نہ کی اور اپنے وجود کو ایک دلفریب معمہ بناکر روپوش ہوگیا لیکن نسیم! یہ اپنی ہی کمزوری تھی۔

دریا سے سڑک تک وہ میرے ساتھ رہا۔ اور میں نے بھول کر بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اپنی غلطی کا خمیازہ خود مجھے بھگتنا ہوگا۔ آج چار روز سے برابر اخبارات میں میرا پیام شائع ہو رہا ہے۔ مگر اب تک نہ وہ آیا۔ نہ اُس کی کوئی اطلاع میں نے بہر حال اپنا فرض ادا کیا۔ اُس نے مجھکو بھلا دیا۔ تو مجھے بھی اس کو بھول جانا چاہیئے۔ لیکن اُس کو بھول جانا اب میرے امکان کی بات ہے؟

نسیم یہ سوچ کر آبدیدہ ہوگئی۔ دل چاہا کہ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگے۔ مگر کسی کے قدموں کی چاپ پا کر وہ آنسو پی کر بیٹھ گئی۔ اور عالم یہ کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

—— "کہو کیسی طبیعت ہے نسیم"!

—— "اچھی ہوں۔ بھائی جان"! اس نے جواب دیا

عالم ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہنے لگا۔

—— اس نوجوان کا تو کچھ پتہ نہ چل سکا۔ جن جن لوگوں کی بابت خیال تھا۔ ان سب سے معلوم کیا۔ مگر کوئی اثبات میں جواب نہ دے سکا۔ تم نے جو حُلیہ بتایا تھا۔ اُس سے میں نے سمجھا تھا کہ شاید یہ کارگذاری جمال سے سرزد ہوگئی ہو۔ حالانکہ اُس سے ایسے شجاعانہ فعل کی توقع نہیں ہوسکتی تاہم بمقتضا، احتیاط پوچھ لیا گیا۔ اس نے بالکل لاعلمی ظاہر کی۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ میں اُس روز اُس سڑک پر گذرا ہی نہیں"۔

نسیم عالم کی گفتگو سنتی رہی اور کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کے

خیالات میں ایک طوفان سا برپا تھا۔ جس کو وہ طویل خاموشی سے ٹال رہی تھی۔ عالم بار بار اس کے چہرے کو تک رہا تھا اور اندازہ کر رہا تھا کہ الھڑ دوشیزہ کہاں تک اس کی باتوں کو قابل اعتبار سمجھتی ہے

بات یہ تھی کہ عالم فطری طور پر انتہائی چالاک اور بدخو واقع ہوا تھا۔ اس کے باپ نواب اختر شکوہ رئیس سعد آباد نے اسی بنا پر اپنی زندگی میں اولاد کے مابین بٹوارہ کر دیا تھا۔ کل زر نقد دس لاکھ نسیم کے نام اور املاک وجائداد عالم کے نام مختص کر دی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُن کی حیات کے بعد عالم اپنی سوتیلی بہن نسیم سے بدسلوکی کرے گا۔ عالم بھی اس سے بے خبر نہ تھا۔ اور اس قسم کی تحریروں کو بچوں کا گھروندہ سمجھتا تھا۔ اس نے نسیم کو تفریح کے بہانے بلا کر عزم مصمم کر لیا تھا کہ راہ میں آنے والے اس کانٹے کو پہلے ہی صاف کر دے۔ مگر بلدیو اور بھوانی کا وار خالی گیا اور جمال کے ناگہانی ورود نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ نسیم کے جذبات سے بھی اس کو کماحقہ وقفیت تھی بلدیو اور بھوانی نے اس کو جمال کی پوری شباہت بتائی تھی۔ وہ سمجھ حکا تھا کہ نسیم کو جمال سے لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر دونوں میں ملاپ کی کوئی صورت نکل آئی تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے اسی لئے اپنے دونوں آدمیوں کو سعد آباد واپس کر کے اُس نے سارا پروگرام ملتوی کر دیا تھا اور معاملہ کو دبانے کے لئے نسیم کو مشورہ بھی دیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ وطن واپس جائے نسیم اب تک چلی بھی گئی ہوتی۔ مگر نامعلوم مہمان کے آجانے کا سہارا اس کے لئے

پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا وہ سوچتی تھی کہ شاید اس کا مقدر یاوری کر جائے اور خیالی دنیا کی عملی تعمیر کرنے والا تلاش سے مل جائے۔ مگر عالم کی باتوں سے رہی سہی اُمید بھی ٹوٹ گئی اور اُس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا

"بھائی جان! پھر مجھے گھر ہی بھجوا دیجئے۔ یہاں میری طبیعت واقعی اُلجھتی جا رہی ہے"

"میں نے اُس روز یوں ہی کہہ دیا تھا" عالم نے تصنع کرتے ہوئے کہا۔ "تمھاری طبیعت دو چار روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی تو تم نے یہاں کے قابل دید مقامات بھی نہیں دیکھے"

لیکن نسیم جانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اور عالم کا دلی منشا بھی یہی تھا۔ جہاں تک ہو سکا اُس نے نسیم کو اور بھی یقین دلا دیا کہ وہ جس کی جستجو میں ہے اُس کا ملنا ناممکن ہے۔

آخر دوسرے روز نسیم ارمانوں کی اُجڑی ہوئی دُنیا لے کر رخصت ہو گئی مگر چلتے چلتے عالم سے کہہ گئی "بھائی جان۔ اُس نوجوان کا خیال رکھئے گا" یہ کہتے وقت اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو چھلک آئے جن کو اس نے منہ پھیر کر پونچھ ڈالا اور عالم نے بھی دیکھی ان دیکھی برابر کر دی۔

باب ۳

ہے دل کو تردد کہ چمن جاؤں نہ جاؤں
صیاد نے چھوڑا ہے کلیجہ سے لگا کے
حریف سیتاپوری

یونیورسٹی میں اپنی عمر کے چھ سال گذار کر جمال کو محنت کا صلہ ملا۔ ایم اے کی سند لے کر اُستادوں کی دعاؤں کے سایہ میں وہ کمپاؤنڈ سے نکلا۔ احباب ساتھ چھوڑ چھوڑ کر جا چکے تھے صرف وہی ایک ایسا بدقسمت طالب علم تھا جو شاہراہ پر کھڑا سوچ رہا تھا۔ طالب علمی کا سنہرا دور اور ہوسٹل کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اُسے یاد آرہا تھا۔ نظروں میں وہ زمانہ گردش کر رہا تھا جب کس مپرسی کے عالم میں وہ وطن سے نکلا تھا۔ اجداد کی چوکھٹ آباد کرنے کی تمنا دامن کشاں تھی۔ نسیم کی خیالی تصویر حیا آمیز شوخی سے پوچھ رہی تھی۔

—"کیوں جمال! میری التجاؤں کے باوجود الوداعی ہنگام بھی مجھے فراموش کر دوگے۔ میں نے اخبارات کے ذریعہ تمھیں دیکھنے کی تمنا کی۔ عالم کے توسط سے تمھارا پتہ معلوم کرنے میں مساعی رہی۔ اگر تم مجھ سے روٹھ گئے تھے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تعلقات کا رشتہ مضبوط ہونے سے

قبل ہمیشہ کے لئے توڑ دو۔ عالم کی کشیدگی تمھاری سد راہ ہے۔ تو مجھے ایک ناکردہ گناہ کی پاداش کا سزاوار نہ سمجھو۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ میں عالم کی بہن ہوں۔ مگر میری روش سے تم نے اس کا اندازہ تو کر ہی لیا ہو گا کہ تمھاری ذات کے لئے میں اس کے خیالات سے متفق نہیں ہو سکتی آج تم ایسی منزل میں ہو۔ جہاں سے چاہو تو مجھے پانے کی کوشش بھی کر سکتے ہو اور نہ چاہو تو دائمی جدائی کے اسباب بھی مہیا ہو سکتے ہیں۔ ایک قدم پیچھے ہٹانے کے معنی یہی ہوں گے کہ پھر تمھیں میری کوئی خبر نہ رہے۔ عقل سے کام لو۔ آؤ۔ میں تمھاری منتظر ہوں اور تمھاری عزت کی ضمانت دار ہوں“۔

—جمال ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے قدم آگے بڑھ بڑھ کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ آخر وہ فیصلہ کن انداز میں یوں اُٹھا۔

”امارت۔ اور افلاس میں زمین آسمان کا بُعد ہے نسیم تمھارا خیال ہمیشہ دل میں چٹکیاں لیتا رہے گا۔ مگر تم سے ملنا پُرانے زخموں کو تازہ کرنا ہے۔ ہاں کبھی اس قابل ہو سکا تو تمھیں اپنانے کی کوشش کروں گا“

—سامان ایک قلی پر رکھوایا اور آہستہ آہستہ اسٹیشن کی سمت روانہ ہو گیا۔

”گلزار لین“ کا ٹکٹ خریدا اور ٹرین میں بیٹھ کر مستقبل کی تاریک راہوں میں گم ہو گیا۔ اُمید کی شعاعیں خضر منزل تھیں۔ راستہ لامعلوم اور ناہموار تھا۔ صدہا ٹھوکریں کھائیں۔ اور پھر سنبھل سنبھل کر چلتا رہا آخر ایک مسافر کی آواز کان میں آئی۔

—"کہاں تک جائیے گا آپ"؟

— خیالات کا قلعہ مسمار ہو گیا۔ اس کو ایک دھچکا سا لگا اور سیکڑوں فیٹ کی بلندی سے نیچے آ گرا۔"گلزار مین تک ارادہ ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

—"کیا آپ وہیں کے رہنے والے ہیں"۔ مسافر نے پھر سوال کیا

—"جی ہاں"۔ جمال نے کہا۔"والد مرحوم رہتے تھے۔ مکان اب بھی ہے میں حصول تعلیم کے سلسلہ میں باہر تھا دس سال بعد وطن جا رہا ہوں"۔

مسافر کو اگلے اسٹیشن پر اُترنا تھا۔ وہ اپنا سامان درست کرنے میں لگ گیا اور جمال پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ وطن کے ذرے ذرے کی تصویر نگاہوں میں پھر گئی۔ اقربا سے ملنے کا خیال دل میں گدگدی پیدا کرنے لگا۔ گھر کے در و دیوار جس میں بچپن کی فردوسی زندگی گذری تھی۔ آغوش کھولے اس کو اپنی طرف بڑھتے معلوم ہوئے۔ ٹرین "گلزار مین" کے اسٹیشن پر رُکی۔ مگر آہ۔ غریب کی دُنیا! "گلزار" کا پتہ پتہ اس کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ہر شے بیگانہ دشی سے دامن سمیٹ رہی تھی۔ دیس سے پردیس کی بو آ رہی تھی اس نے ایک کرایہ کے تانگے پر سامان لدوایا۔ اور خود بھی اس پر بیٹھ کر تانگے والے کو ایک سمت چلنے کا اشارہ کیا۔ عمارتوں کی تراش خراش۔ راستوں کی بناوٹ بالکل بدل چکی تھی۔ اس کا گلزار اس گلزار سے الگ کسی دوسرے مقام کا تصور تھا۔ وہ رہ رہ کر حافظہ پر زور دیتا ہوا۔ مختلف غلط راستوں سے گھوم کر ایک مکان کے قریب آ کر ٹھہرا۔ دیر تک آبدیدہ ہو کر ٹوٹے ہوئے در و دیوار کو تکتا رہا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ تانگہ کی آواز سُن کر

ایک خمیدہ پشت بزرگ باہر نکلے اور جمال سے سوال کیا "میں نے پہچانا نہیں آپ کو؟"

— جمال نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا "چچا جان میں آپ کا غلام جمال ہوں"۔ کرامت حسین دوڑ کر بھتیجے سے لپٹ گئے۔

— "میرے مرحوم بھائی کی نشانی۔ خدا نے اس آخر وقت تیری صورت دکھادی۔ بیٹے۔ زمانہ بھر چھان ڈالنے پر بھی جب تیرا پتہ نہ چلا تو تیرا بوڑھا چچا مایوس ہو کر بیٹھ رہا۔ ہائے۔ آج میرا بھائی زندہ ہوتا تو کتنی خوشی ہوتی اس کو!"

کرامت حسین وفور جذبات میں جمال کو چمٹا چمٹا کر پیار کرنے لگے۔ اہل محلہ کا جماؤ بھی شروع ہو گیا ہر شخص نے اس سے بغلگیر ہو کر کرامت حسین کو مبارکباد دی۔ آخر جمال سب سے رخصت ہو کر چچی کی خدمت میں حاضر ہوا چھوٹے چھوٹے بھائیوں سے ملا۔ اور چچا کی سرپرستی میں باپ کی ڈیوڑھی آباد کی۔

باب ۴

"گلزارین" کی سجاوٹ کا شہرہ جو کچھ تھا۔ وہ ایک آفتاب کی طرح چمکتی ہوئی حقیقت تھی۔ ہر اہل نظر جس نے ایک مرتبہ بھی آنکھیں کھول کر دیکھا ہو انکار نہیں کر سکتا۔ ایک طرف اس کے پر فضا باغات کشمیر کے زعفران زار پر ہنس رہے تھے۔ تو دوسری طرف سر بفلک عمارتیں جدید صناعی کا نمونہ پیش کرتی تھیں۔ بازاروں کی باقاعدگی اور رونق۔ جابجا کشادہ پارکوں کی بناوٹ ہر نووارد کے لئے سیر و تفریح کی دعوت تھی۔ کتب خانے میں عہد قدیم اور دور حاضرہ کی کتابوں کا ذخیرہ اور نواب عالیجاہ کے دربار میں باکمالوں کا اجتماع ہارون رشید کا بغداد یاد دلا رہے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ پر مگر نظام حکومت کی ابتری اور رعایا کی تہی دستی آنباد فرمان روا کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا تھی۔ نواب عالیجاہ کی رحمدلی ضرب المثل مفلوک الحال باشندے جب بھی حضوری کا موقع پاتے دامن مراد بھر کر پلٹتے۔ لیکن یہ عارضی صورتیں عام پریشانیوں کے ازالے کو کافی نہ تھیں۔ "گلزارین" کے گوشہ گوشہ سے روزی کا سوال اٹھایا جا رہا تھا غریبوں کی بھوکی آتما مالک کو دعائیں دے دے کر وزیر اعظم کو کوس رہی تھی۔ لیکن ظالم کی رسی دراز وہ نت نئے ستم ڈھانے پر تلا ہوا تھا۔ کہیں ٹیکس

میں اضافہ۔ کہیں درآمد برآمد پر پابندیاں۔ جہاں تک ملازمت ریاست کا تعلق ہے حدود ریاست کے ساکن نااہل قرار پا چکے تھے۔ وزیراعظم کے ہموطن ہونے کا شرف تمام فضیلتوں پر افضل اور ہر سند پر قابل ترجیح تھا صرف یہی نہیں۔ بلکہ پرانے ملازمین جو ٹک رہے تھے۔ نامعتبر گردان کر کے یا مخالفت ریاست کے الزام میں مورد عتاب تھے۔ وزیر مالیات جو اپنی عمر کا بیش قیمت حصہ وفادارانہ خدمات میں گزار کر حق نمک ادا کر چکا تھا۔ مار آستین سمجھ کر ٹھکرایا جا رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ وزیراعظم کو نواب عالیجاہ سے قرابت پر زعم تھا اور نواب عالیجاہ بھی اس کو اپنا سمجھ کر بگاڑنا اچھا نہ سمجھتے تھے۔ سب کچھ اُسی کی رائے پر چھوڑ رکھا تھا۔ سیاہ کرتا یا سفید کوئی مداخلت کرنے والا نہ تھا۔ اگر کبھی اندرونی خلفشار کے زیر اثر کوئی باز پرس بھی ہوئی تو اس نے خود اختیاری نوعیت سے معاملہ کو بنا کر سمجھا دیا اور خوش اسلوبی سے رفع دفع کر دیا۔

جمال نے اپنے دوران قیام میں حالات کا پورا جائزہ لیا۔ اور غریبوں کی آہوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ ریاست کی ملازمت اُسے طبعًا ناپسند تھی اور پھر ایسے ماحول میں۔ مگر وہ وطن کی رنگینیوں میں اُلجھ چکا تھا۔ جی نہ چاہتا تھا کہ اتنی جلد پھر پردیس کو واپس جائے۔ چچا کی مالی مشکلات ذریعہ معاش پیدا کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس نے طے کیا کہ کچھ روز ملازمت کر کے بسر اوقات کرنا چاہیے۔ جس کا اظہار اس نے کرامت حسین سے بھی کر دیا۔ کرامت حسین وزیر مالیات کے دفتر کے پنشن یافتہ کلرک تھے اُن کی

بزرگی اور شرافت کے لحاظ سے ہر چھوٹا بڑا ان کا ادب کرتا تھا۔ انھوں نے اُسی وقت کپڑے پہنے اور وزیر مالیات کے بنگلہ پر حاضری دی۔ کل واقعہ بیان کر کے اپنی خدمات کے صلہ میں جمال کی ملازمت کی درخواست کی۔

شریف وزیر نے کہا

—— "فی الحال میرے ریڈر کی جگہ عارضی طور پر خالی ہے۔ ان کو کام کرنے دیجئے۔ اس کے بعد حیثیت کے مطابق کوئی جگہ تجویز کی جائے گی"

—— چچا کے حکم کی تعمیل میں اطاعت شعار بھتیجہ کوئی عذر نہ کر سکا۔ اور کار منصبی پر حاضر ہو گیا۔ چند ہی روز میں اس نے اپنی قابلیت کا ایسا سکہ جمایا کہ ہر جزو کل پر حاوی ہو گیا۔ وزیر مالیات کو ہونہار نوجوان سے اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ بغیر اس کے اس کی ہر نشست بے کیف اور ہر محفل بے رونق بن گئی۔ یہاں تک کہ اوقات دفتر کے علاوہ وہ آپس میں مساویانہ حیثیت سے ملنے لگے۔

جمال کی ہر صبح وزیر کے بنگلہ پر اور شام ہواخوری میں گذرتی تھی باغات کی تفریح میں اگر کوئی دوست مل گیا تو ساتھ ہولیا۔ ورنہ عموماً وہ اکیلا ہی لطف اندوز ہوتا تھا۔ سفید گلاب کی کیاریاں خاص طور سے اس کی دلچسپی کا مرکز تھیں۔ وقت کا زیادہ حصہ انھیں سادہ پھولوں سے نظربازی میں گذر جاتا اور اندھیرا ہونے پر وہ دوسرے نظارے کا ارمان لے کر واپس ہوتا "گلزارمین" کا غنچہ غنچہ اس سے روشناس ہو چکا تھا اور دل سے اس کا معترف تھا۔ مگر شخصی حکومت کی پابند نظریں جب اس کو

اتنے سادہ لباس میں دیکھتیں تو اس کی شخصیت کی وقعت گر جاتی تھی۔ ہاں اس کے بجائے دلوں پر حسن اخلاق کا نقش جم کر ہمیشہ کے لئے اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔

جمال دیکھنے میں گورا چٹا نہ تھا۔ مگر اس کے گھونگریالے بال۔ بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور گٹھیلے جسم کا اعضا سے تناسب ایسا بھی نہ تھا کہ دیکھنے والا سرسری نظر سے دیکھ کر نکل جائے۔ سب سے زیادہ گندمی رنگ نے اس کو حسن ملیح کا کامل نمونہ بنا دیا تھا۔ سادی پوشاک میں اس کی جامہ زیبی کچھ اس طرح نکھر جاتی کہ تفریح کے ہنگام وہ خود اہل نظر کے لئے مرجع تفریح بن جاتا تھا۔

نواب عالیجاہ کے مخصوص پارک میں گلاب کے نئے گملے آنے کی شہرت تھی۔ یہاں عام لوگوں کو داخلے کی اجازت تو نہ تھی۔ مگر متوسلین ریاست کے لئے ممنوع بھی نہ تھا۔ دیکھنے والے پھولوں کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ جمال بھی اپنا ذوق سلیم لے کر بڑھا۔ پھولوں کی سادگی پر ہزار رنگینیاں قربان۔ سفید پتیوں پر سرخ رنگ کی گلکاریاں دیکھ کر دل تڑپ اُٹھا۔ نظر جم کر رہ گئی۔ اندھیرا بھی ہونے لگا۔ مگر اس کے انہماک میں کچھ کمی نہ ہوئی روش پر گذرنے والی ایک فٹن کی آہٹ پر اس کی نظر اٹھی اور چلنے کا خیال آیا۔ دامن جھاڑ کر وہ اُٹھا اور انگڑائی لیتا ہوا چمن سے باہر نکلا۔ فٹن تھوڑی دیر چل کر واپس ہوئی اور اس کے پاس آکر ٹھہر گئی۔ مگر وہ کمال بے اعتنائی سے چلتا رہا۔ حتیٰ کہ کسی کی مرتعش اور سریلی آواز

اس کو سنائی دی۔
—— کیا آپ مجھ تک آنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟"
—— اس نے پلٹ کر دیکھا۔ فٹن کے سہارے ایک پری جمال خاتون کھڑی ہوئی اس کی طرف پُراشتیاق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس ملکوتی ادا سے پہلے تو مرعوب ہو کر ٹھٹھک گیا۔ مگر پھر خود بخود اس کے قدم اُٹھنے لگے۔ چند لمحے حسن آفریں شباب کا نظارہ کر کے ادب سے مخاطب ہوا "میں حاضر ہوں۔ کیا حکم ہوتا ہے"؟
خاتون نے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسی چمن کی طرف قدم بڑھایا۔ جہاں سے اُٹھ کر وہ ابھی آیا تھا۔ گلاب کی کیاریوں کے قریب پہنچ کر وہ بیٹھ گئی اور جمال کو بھی اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
—— وہ حیران تھا کہ یہ نوجوان حسینہ کون ہے؟ اس کی طلبی کی غرض کیا ہے؟ شکل وصورت اور پوشش سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ اس کا تعلق دودمان عالی سے ہے۔ مگر یہ سب قیاسات تھے صحیح پتہ معلوم کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کئی بار ارادہ کیا۔ مگر کچھ پوچھنے کی جسارت نہ کر سکا نوجوان خاتون بھی رہ رہ کر اس کی طرف دیکھتی اور گردن جھکا لیتی۔ آخر ایک مرتبہ اس کا ہاتھ ایک خوبصورت پھول لے کر اُٹھا اور جمال کے لوٹ کالر پر آ لگا۔ مترنم لہجہ میں یہ الفاظ بھی سنائی دیے۔
—— "عاصمہ کی پُرخلوص نذر قبول فرمائیے"۔
—— نام معلوم ہو جانے پر بھی وہ خیالی اُلجھن میں مبتلا رہتا۔ اگر عاصمہ اپنے

سلسلۂ کلام کو جاری نہ رکھتی۔ قدرے توقف کرکے عاصمہ نے پھر کہا۔
—— "میں نے ابھی آپ کو انھیں پھولوں کے نزدیک دیکھا تھا اور کچھ ایسا محسوس کیا کہ میرے پسندیدہ پھول آپ کو بھی پسند آئے گویا ان کی وساطت سے آپ مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے معلوم ہوئے۔"
—— اب جمال سے بھی خاموش نہ رہا گیا۔ اس نے شکریہ ادا کرکے سوال کیا
—— کیا میں یہ معلوم کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ معزز عاصمہ کی مزید تعریف کیا ہے"؟
—— "میں یہاں کے وزیر اعظم کی بیٹی ہوں اور غالباً کسی نووارد نوجوان سے ہمکلام ہوں" عاصمہ نے متبسم ادا سے جواب دیا۔
—— "میں آیا تو حال ہی میں ہوں لیکن میرا تعلق یہاں سے پیدائشی ہے" جمال نے کہا۔
—— "کیا آپ کہیں باہر چلے گئے تھے"؟ عاصمہ نے پھر سوال کیا
—— "جی ہاں۔ پدر محترم کے انتقال کے بعد میں حصول تعلیم کے لئے چلا گیا تھا" جمال نے جواب دیا اور عاصمہ کے مزید استفسار پر اپنی عارضی ملازمت کا اظہار بھی کردیا۔

رسمی گفتگو کے بعد عاصمہ نے جمال سے دوسرے روز پھر تفریح کا وعدہ لیا اور اس کو اثبات ہی میں جواب دیتے بن پڑا۔ نسوانیت کی ادا سے وہ اُٹھی۔ اور الوداعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر جیسے ہی جمال کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے مس ہوا۔ اس کے رخساروں پر مسرت کی سرخی دوڑنے لگی

جس نے حسن کی تابانی کو اور اُجاگر کر دیا۔ وہ رازدارانہ انداز میں جمال کی طرف جھکی اور کہنے لگی۔

—— "جمال صاحب! ہم لوگ سماج و رواج کے زیادہ پابند نہیں ہیں۔ مگر جب تک یہاں رہتے ہیں کچھ نہ کچھ دکھاوا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ابھی ہمیں اپنی ملاقاتوں کو راز میں رکھنا چاہیئے۔ اس طرح میری آزادانہ گفتگو کا حال اگر کُھل گیا تو بدنامی کے علاوہ مجھ پر پابندیاں بھی عائد ہو جائیں گی مجھے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ کبھی کبھی آپ کو دیکھتی رہوں"۔

—— "ان حالات میں آپ کو آج بھی احتیاط کرنا تھی۔ اتنی عنایت مجھ سے گمنام پر کوئی فرض نہیں اور آئندہ کے لئے تو بہر حال میری یہی گذارش ہوگی کہ آپ اس قسم کا خیال بھی دل میں نہ لائیں"۔ جمال نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔

—— "ابھی آپ نے کل ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ میری باتوں پر اُسے فراموش نہ کیجئے۔ میں نے جو کچھ عرض کیا صرف احتیاط کا تقاضہ ہے۔ آپ سے نہ ملنا اب میرے امکان کی بات نہیں"۔ عاصمہ نے کسی قدر بیقرار ہو کر کہا۔

—— کہنے کو وہ کہہ گئی مگر اس کی آنکھیں فرط حیا سے گڑ گئیں اور وہ جواب کا انتظار کئے بغیر یہ کہتی ہوئی رخصت ہو گئی کہ "اچھا جمال۔ کل اسی وقت تمہارا انتظار کروں گی"۔

جمال اور عاصمہ کی خفیہ ملاقاتوں نے دونوں میں ایک قلبی لگاؤ پیدا کر دیا۔ بالخصوص عاصمہ کی بیقراری دن بدن بڑھتی گئی۔ اگر جمال کو کسی دن

دیر ہو جاتی تو وہ ٹہل ٹہل کر راہ تکتی رہتی اور اس وقت تک مضطرب رہتی جب تک جمال کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آکر تاخیر کی معذرت نہ کر لیتا۔ دیکھنے والے حالات کو دیکھ رہے تھے اور آپس میں اُن کی محبتوں کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ مگر اُن کو کسی کی انگشت نمائی کا ہوش نہ تھا۔ عاصمہ کو جمال سے ایک شکایت ضرور تھی کہ وہ اس کو دیکھ کر کبھی کبھی ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا ہے۔ مگر یہ راز صرف جمال اور اس کے دل تک محدود تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود عاصمہ اس کی تہہ تک پہونچ نہ سکی۔
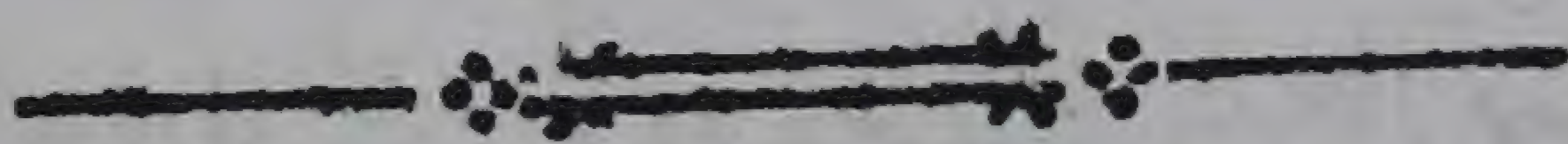
باب (۵)

جمال نے پوری پوری رات پلنگ پر کروٹیں بدل کر کاٹ دی۔ عاصمہ کی رنگین ملاقاتوں کے تصور میں صدہا خیالی جنتیں بن بن کر بگڑ گئیں دل کے پرانے ناسور ہرے ہو گئے۔ ماضی کی رنگینیاں خواب پریشاں بن کر سامنے پھرنے لگیں۔ عاصمہ کے انداز گفتگو کی یاد میں اکثر قلب میں گدگدی پیدا ہوئی۔ وہ حسن و شباب کی کیف پرور اداؤں سے متاثر ہوا اس لئے نہیں کہ وہ عاصمہ کی طرف کھنچ رہا تھا بلکہ اس لئے کہ اس کے دل میں یہ ارمان پیدا ہو گیا تھا کہ کاش عاصمہ کے بجائے نسیم اُسے دعوت نگاہ دیتی اور وہ محبت کا جواب محبت سے دے سکتا۔ گاہے گاہے یہ خلش پیدا ہوتی کہ " عاصمہ اس کو چاہتی ہے۔ وزیر اعظم کی خوبصورت بیٹی اس سے محبت کرتی ہے۔ اور الوداعی ہنگام دوسرے دن ملنے کا وعدہ لے کر رخصت ہوتی ہے مگر

—— جمال۔ میرے دل کے گوشہ میں اس کی محبت کی تڑپ نہیں ملتی۔ کیا تو ایک عورت کے جذبات سے کھیلنا چاہتا ہے کیا تجھ میں اتنی بھی شرافت باقی نہیں کہ ایک باعصمت خاتون کی عزت پر حرف نہ آنے دے۔ وہ وہ وزیر اعظم کے گھر کی زینت تو ایک معمولی خاندان کی فرد۔ تیرا مقدر تھا

ساون کے نظارے ہیں" "ساون کے نظارے ہیں"
عاصمہ ایک نوجوان کے ساتھ فٹن سے اتری اور باغ میں داخل ہوئی۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساری زیب جسم تھی۔ کانوں میں آبدار موتیوں کے گوشوارے جھلجھلا رہے تھے۔ بالوں کی لٹیں رخساروں کے قریب دونوں جانب لٹک رہی تھیں اس پر پھوہار کی مہین مہین بوندیں موتیوں کی طرح جڑی ہوئی تھیں۔

عرق آلود زلفیں ہیں رُخ رنگین جاناں پر
ترشح کا ہے عالم۔ ابر چھایا ہے گلستاں پر

—— عاصمہ کا ساتھی بار بار للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ بے اعتنائی سے خراماں خراماں چل رہی تھی، دونوں ٹہلتے ٹہلتے جمال کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن وہ اپنی دھن میں دنیا و مافیہا سے الگ موسیقی کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا عاصمہ قدرے پیچھے ٹھہر گئی۔ اس کے ساتھی نے بڑھکر جمال کو مخاطب کیا۔

—— "ہیلو۔ مسٹر جمال۔ اس قدر بے خبری!

—— عالم کی آواز پر جمال نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا اور حیرت کے ساتھ اس کی زبان سے نکلا۔

—— "عالم۔ تم یہاں کہاں"؟

—— "وزیرِ اعظم میرے عزیز ہیں۔ انھیں کے سلام کو آیا ہوں" "مگر تم اپنی بتاؤ"؟ عالم نے استفسار کیا۔

اگر تو اس کی قدر کرنے کے لائق ہوتا۔ اور پھر جب وہ خود تجھکو چھیڑ چھیڑ کر محبت کی دعوت دے رہی ہے۔ کیا تیرا فرض نہیں؟ کہ تو اپنے کو اس کے لئے بیقرار بنا۔ کمبخت جمال! اگر عاصمہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہی اور عشق کی چنگاریاں بھڑک گئیں تو اس کی تباہی صرف تیری بوالہوسی کا نتیجہ ہوگی۔ جواب دینے کی ہمت نہیں ہوتی تو اس سے ملنا جلنا ہی ترک کر دے۔"

—— اسی قسم کے تفکرات میں صبح ہوگئی۔ وہ بستر سے اُٹھا۔ اور ضروریات سے فارغ ہوکر اپنے محسن وزیر مالیات کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس نے ہفتوں تک ہواخوری کا پروگرام ملتوی رکھا۔ لوگوں کو اِس تغیر پر تعجب تھا۔ مگر اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرکے بات بنادی ایک روز اودی اودی گھٹائیں آسمان پر چھا رہی تھیں۔ ہلکا ہلکا ترشح ہو رہا تھا۔ وہ دفتر سے واپس ہوا۔ آسمان و زمین کی دلفریبی پر دبی ہوئی اُمنگیں عود کر آئیں۔ دل مچل گیا بلا ارادہ اس کے قدم اُٹھنے لگے۔ شہر سے دور آموں کے ایک باغ میں پہنچ کر جھینگروں کی آواز اور کوئل کی کوک نے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا۔ ماضی کے دھندلکے میں دوستوں کے ہنگامے دریا کا کنارا اور لہروں کی چھیڑ چھاڑ نظر آنے لگی۔ جمال نے بیتاب ہوکر ایک درخت کی شاخ کا سہارا لیا۔ اور عالم مستی میں الاپنا شروع کیا۔

"ساون کے نظارے ہیں" "دریا کے کنارے ہیں"

—— ایک فٹن آئی۔ باغ کے قریب رُکی۔ لیکن اس کو خبر نہ ہوئی۔ وہ مدہوشی میں لہریں لیتا رہا۔

جمال نے مختصر لفظوں میں اپنی ملازمت کا قصہ بیان کر دیا۔ عالم نے اس کی سرگذشت سُن کر عاصمہ کی طرف مڑ کر دیکھا وہ کچھ دور کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ جمال کی نظر اب تک اس پر نہیں پڑی تھی۔ عالم کے ساتھ اس نے بھی نگاہ اُٹھائی۔ آنکھوں میں ایک بجلی سی کوندگئی۔ عاصمہ کے زاہد فریب حُسن نے آج جمال کے قدم بھی ڈگمگا دیئے۔ مگر اس نے سنبھل کر عالم سے سوال کیا

—— "آپ کی تعریف؟"

—— عالم نے عاصمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جمال سے تعارف کرایا۔ مگر وہی سوسائٹی اور پوزیشن کی آڑ لیکر کہنے لگا۔

—— "وزیراعظم صاحب کی صرف میرے ساتھ خصوصیات ہیں کہ عاصمہ کو تنہا آنے کی اجازت دے دی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کسی موقع پر اس کا اظہار نہ ہونے دیں گے کہ آپ اس کو جانتے ہیں۔ ورنہ میری توہین کا باعث ہوگا"

—— "میں اس وقت بھی یہی سمجھ رہا ہوں کہ میں وزیراعظم کی معزز بیٹی سے ناواقف ہوں ورانحالیکہ آپ نے ابھی تعارف کرایا ہے مگر تعارف دو برابر کی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ کہاں وزیراعظم۔ کہاں میں؟

—— جمال نے اپنے خیال میں اس موضوع کو ختم کر کے عالم کو دیکھا۔ مگر وہ چھیڑنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے پھر کہا

"جمال۔ اگر برا نہ مانو تو کہہ دوں۔ کیا تمھاری وہ قابلیت صرف یونیورسٹی تک محدود تھی؟"

—— "میری استعداد جو کچھ اس وقت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اُس سے

ہزار درجہ زیادہ ہے" جمال نے پرغرور لہجہ میں جواب دیا لیکن عالم اتنی آسانی سے مات کھانے والا نہ تھا۔ اس نے اپنا آخری تازیانہ لگایا اور کہنے لگا

—"تمھارا بیان حقیقت کے منافی ہے۔ اُس وقت جمال ایک ایسی ہستی کا نام تھا جس نے عالم کو ذلیل طور پر شکست دی تھی۔ لیکن آج جمال دفتر کے اُس کلرک کا نام ہے جو وزیراعظم یا عالم جیسی شخصیتوں کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہے"

جمال اس حربہ کی تاب نہ لاسکا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ حقارت آمیز انداز میں اس نے عالم کو خطاب کیا۔

—"عالم! تمھارے دماغ سے تکبر نہ کبھی نکلا ہے نہ نکلے گا۔ تم سمجھتے ہو کہ چھوٹی ملازمت کرلینے سے انسان کی عزت نفس بھی جاتی رہتی ہے۔ جمال کا بچپن کا کردار تو تم دیکھ ہی چکے۔ اُس وقت وہ صرف کسی تخیلی خاکے کے مرادف تھا۔ جوانی کی منزلوں میں اُس کے نقوش گہرے ہو چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی وہ خوش آئند معلوم ہوتا ہے اور اب اتفاقات نے تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ مگر سونا مٹی میں مل کر بھی سونا ہے اور کسی پری پیکر کے کانوں کے گوشوارے بن کر بھی سونا ہے"

—اس پھبتی پر عاصمہ کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ مگر عالم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ جمال نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ اپنی تقریر پھر جاری کی

—"عالم! تم میرے بچپنے کے ساتھی ہو۔ تم نے ہمیشہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو دعوتِ نظر دی ہے۔ مگر بھول کر بھی شیشے اور ہیرے کی چمک میں امتیاز کرنے کی کوشش

نہیں کی. میرے خیال میں جوان ہو کر بھی تم اتنے ہی نادان اور ناتجربہ کار ہو جتنا ہوسٹل کی چہار دیواری میں کوئی نوعمر طالب علم۔"

—— جمال یہ کہکر خاموش ہو گیا۔ عالم پہلے تو سراسیمہ نگاہوں سے اس کو تکتا رہا۔ پھر یکایک اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک پیدا ہو گئی۔ دو قدم جمال کی طرف بڑھ کر کہنے لگا۔

—— "مجھے صرف اس کا پاس ہے کہ کبھی تم میرے ہم مکتب رہے ہو۔ ورنہ اس توہین کا ایسا انتقام لیتا کہ تمھیں عمر بھر یاد رہتا۔"

—— "کردار کی عظمت مشکلات سے مرعوب نہیں ہوتی۔ باطل کے پہاڑ حق پرستوں کا سر جھکا نہیں سکتے۔ تمھاری ان گیدڑ بھبکیوں کا اثر مجھ پر نہ کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکے گا۔" جمال نے اطمینان اور سنجیدگی سے جواب دیا اور بے پروائی سے ایک شاخ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

عالم نے جب کسی طرح قابو چلتے نہ دیکھا تو جھلا کر چلا اور بغیر کچھ کہے سنے فٹن پر آ بیٹھا۔ اس کے یوں چلے جانے کے بعد عاصمہ فٹن کی طرف جانے کے بجائے جمال کی طرف بڑھی اور پیار کے لہجہ میں کہنے لگی۔

—— "جمال تمھارے تیر نظر کی گھائل تو میں پہلے ہی تھی۔ آج آواز کی کوک نے کلیجہ بھی برباد دیا۔ عالم کی مشکور ہوں۔ اس کی بدولت صورت تو دیکھنے میں آ گئی ورنہ تمھیں میرے حال پہ کاہے کو ترس آتا۔"

"آپ کی باتیں جانے کس قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ میں بھلا روز روز کیونکر مل سکتا ہوں۔ اگر کسی کو خبر ہو گئی تو اس کا نتیجہ بھی معلوم ہے۔" جمال نے جواب دیا۔

— عالم برابر عاصمہ کو پکارے جا رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔

— "اچھا جمال! اس وقت تو اجازت چاہتی ہوں۔ یہ باتیں کل شاہی پارک میں ہوں گی۔ میں تمھاری منتظر رہوں گی۔"

— یہ کہکر وہ لچکتی ہوئی چلی اور فٹن پر سوار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

عالم کے چلے جانے کے بعد جمال نے بھی مکان کا رخ کیا۔ گو ہمت شکن جوابات دے کر وہ بظاہر بے پرواہی کا اظہار کر چکا تھا۔ مگر عالم کے پچھلے کیریکٹر کی روشنی میں خطرات محسوس کئے بغیر رہ نہ سکا۔ اُس نے بھی دل میں ٹھان لی کہ اگر وزیر اعظم نے عالم کی شکایت پر کوئی بازپرس کی تو انجام سے بے نیاز ہو کر وہ بھی جواب دہی میں دریغ نہ کرے گا۔ اندیشہ صحیح نکلا اور راستہ ہی سے طلبی کے فرمان پر اُسے وزیر اعظم کے بنگلہ پر حاضری دینا پڑی۔ عالم بھی مدعی کی حیثیت سے ایک کرسی پر متمکن تھا۔ آداب منصب بجا لاکر جمال حکم کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ وزیر اعظم نے عالم کی تصدیق کے بعد اس پر ریاست کے معزز مہمان کی منقصت کا چارج لگایا۔ اور اُس نے بھی حسب موقع معقول جواب دیا۔ اپنی صفائی میں یہ استدلال بھی پیش کیا کہ اُن کی اور میری گفتگو سابقہ شناسائی کے باعث عمل میں آئی تھی۔ ریاست کے رکن کی پوزیشن میں اُن کو نہ میں کبھی جانتا تھا اور نہ آج ہی پہچانتا ہوں مگر اس کی کچھ سنی نہ گئی اور عالم سے معافی مانگنے کی شرط پر معاف کر دینے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ جس کے لئے جمال کسی طرح اپنے کو آمادہ نہ کر سکا۔ بڑی سے بڑی سزا بھگتنا اس کے لئے آسان تھا۔ مگر عالم سے معافی مانگنا ضمیر کی موت کو دعوت دینے کے

برابر تھا۔

جمال کا استدلال کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو۔ مگر مطلق العنان وزیر اعظم کے حکم سے سرتابی نظام مملکت کی توہین سمجھی گئی اور وزیر اعظم نے نازیبا الفاظ میں مرعوب کر کے تعمیل کرانے کی کوشش کی۔ اپنے حریف عالم کی موجودگی میں ایسی ہتک جمال کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہا۔ اختیارات کے زعم میں وزیر اعظم نے بھی اس کو سمجھنے میں غلطی کی اور جمال بھی جوانی کی ترنگ میں امارت اور افلاس کے فرق کو نظر انداز کر گیا۔ نتیجہ میں ادھر وزیر اعظم کے منہ سے بدمعاش کا لفظ نکلا۔ اُدھر جمال کی پرجوش آواز اور فرش پر کرسیاں ٹوٹنے کے ہنگامہ سے کوٹھی کے درودیوار گونج گئے۔ عالم بال بال بچ گیا۔ مگر وزیر اعظم کو بد کلامی کی معمولی سزا جھیلنا پڑی جمال سپاہیوں کی حراست میں لے لیا گیا اور بوڑھے کرامت حسین کی دوڑ دھوپ کے باوجود اُسے دو سال قید با مشقت کی سزا ہو گئی غریب عاصمہ کو اس واقعہ کی خبر اُس وقت ہوئی جب حالات قابو سے باہر ہو کر دوسری نوعیت اختیار کر چکے تھے۔

باب ٦

صبح اُٹھنے کی گھنٹی بجی۔ قیدی اُٹھ اُٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگے۔ ایک قیدی نے جمال کے پاس مٹی کے بدھنے میں پانی رکھا اور پکارا

—— "بھیا اُٹھو۔ کام پر چلنے کا وقت آگیا"

—— جمال آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ جلد جلد فراغت حاصل کی اور سب کے ساتھ بیرک سے نکل کر کام میں لگ گیا۔ ابھی قید خانے میں اس کو ایک مہینہ ہوا تھا۔ اور قواعد کے بموجب چکی پیسنے پر اس کی ڈیوٹی تھی۔ ابتدا ابتدا میں تو خود اپنی حالت پر اس کے آنسو نکل آئے۔ لیکن آخر اس کا بلند کردار آڑے آیا۔ وہ استقلال کا سہارا لے کر مشکلات کا مقابلہ کرنے لگا اور دوسرے قیدیوں سے مل جل کر زندگی کی کٹھن منزلوں کو آسان بنانے لگا۔ اس کا معمول تھا کہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنی بیرک کے قیدیوں کے ساتھ بیٹھتا اور ہر ایک سے اس کی زندگی کا کارنامہ بیان کرنے کی فرمائش کرتا۔ کوئی اپنی ڈاکہ زنی کی معرکہ آرا وارادت پر فخر کرتا۔ کوئی کسی عورت کو سربازار اُٹھا لیجانے پر نازاں ہوتا۔ رنگ رنگ کے بداعمالوں کا مجمع تھا۔ سب کی کارگذاریوں کو سُن سُن کر وہ روزانہ اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی اصلاحی واقعہ بیان کرتا رہا۔ اس طرح اس نے اپنی خاموش روش سے تمام قیدیوں کو

گرویدہ بنا لیا اس سے اس کو نہ صرف محنت کم کرنا پڑتی تھی۔ بلکہ ضروریات زندگی میں بہت سی آسانیاں مہیا ہو گئی تھیں بیرک کا پورا گروہ اس کو اپنا سرغنہ سمجھ کر اس کا کام کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے اس قلیل مدت میں چوری۔ نقب زنی اور دیگر قسم کے کاملین کی مہارت تامّہ سے کافی فائدہ اُٹھایا۔ اور ایسے ہر فعل سے کما حقہ وقفیت حاصل کی۔ اکثر وہ "گلزار یمین" کی اقتصادی وسیاسی حالت پر بھی بات چیت کرتا اور اُن سب کو اس کی اصلاح کی دعوت دیتا۔ افعال شنیعہ کے عادی مجرموں پر اس کا کچھ اثر تو نہ ہوتا۔ مگر وہ انداز بیان سے محظوظ ضرور ہوتے اور جمال کی نیک نیتی کا اعتراف کرتے یہی وجوہ تھے کہ قیدی نے اس کی تکلیف کا لحاظ کرتے ہوئے عین وقت پر اس کو جگایا اور ضروریات کا سامان فراہم کر دیا تاکہ وہ سب کے ساتھ چلنے کو تیار ہو سکے۔ اور کوئی اعتراض کا موقع پیدا نہ ہو۔

ڈپٹی جیلر کو آج قیدیوں کا کام تقسیم کرنا تھا۔ ہر ایک کا اعمال نامہ اس کے سامنے تھا۔ اچھا کام کرنے والے کو آسان کام اور خراب کام کرنے والے کو مشکل کام دیا جا رہا تھا۔ تمام قیدیوں کو جو تبدیلیاں کی گئی تھیں بتا دی گئیں۔ اور حاضری کی ہدایت کر دی گئی۔ لیکن جمال کے کام میں کوئی تغیر نہیں ہوا وہ بدستور چکی پر تعینات رہا۔ ایک قیدی نے جرأت کر کے پوچھا بھی۔

—— "ان کو تو ایک مہینہ ہو گیا اور کام کی بابت کوئی شکایت نہیں ہے۔ پھر اصول کے تحت دوسرا کام کیوں نہیں دیا جاتا؟"

"ان کے لئے یہی حکم ہے۔" ڈپٹی جیلر نے جواب دیا۔ اُس نے پھر کہا۔

— صاحب قانون سب کے لئے ایک ہے۔ کوئی وجہ اس کی زیادتی کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

— اب ڈپٹی جیلر نے برافروختہ ہو کر کہا

— "تم کون ہو؟ خدائی فوجدار۔ ہماری جو مرضی ہوگی۔ وہی کریں گے۔"

— قیدی کو بھی جوش آگیا۔ اس نے جواب دیا۔

— "ہم سب آپ کے بس میں ہیں۔ جو چاہے کیجئے۔ ہاں جیل کے باہر ہوتے تو ہماری بات کی بھی کوئی قیمت تھی۔"

— ڈپٹی جیلر تھا مرد معقول۔ سچی بات زہر کے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ اگر واقعی اس کے امکان میں ہوتا تو یہ سختی روا نہ رکھتا۔ مگر بالائی احکام سے مجبور تھا۔ جمال کے متعلق جیل کے کسی افیسر کو کوئی اختیار نہ تھا۔ براہ راست وزیر اعظم کے ہدایت پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس ردو قدح سے کوئی فائدہ تو نہ ہوا۔ ہاں جیل کے تمام قیدیوں کو جمال کی بے گناہی کا یقین ہوگیا۔ اور وزیر اعظم کے خلاف عام انتقام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

جمال پھر چکی پر لگا دیا گیا۔ کام اس کو نہ پہلے کرنا پڑتا تھا۔ نہ اب۔ صرف دکھانے کے لئے ایک طرف اس کا کھڑا رہنا لازم تھا۔ دوسرا ساتھی جو بھی ہوتا۔ مقررہ وزن میں آٹا وقت پر تیار کر دیتا۔ دن گذرتے گئے اور اس کے اثرات کی دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ اب وہ صرف اپنی بیرک کا لیڈر نہ تھا۔ بلکہ پوری جیل کے چار سو اسیر پر اس کی شرافت کے معرف تھے۔ اور اس کے اخلاق پر فریفتہ تھے۔ قیدیوں کو سیاسیات سے دلچسپی پیدا ہو چلی

تھی. ہر دوپہر کو ہموطنوں کی مظلومیت کی داستان دہرانا اُن کے معمول میں تھا. بعض بعض دن تو مجمع پر گریہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور جوش میں دیواریں پھاند جانے کے عزم ظاہر ہو جاتے مگر جمال سب کو سمجھا بجھا کر دھیما کر دیتا تھا. حکام ان کارروائیوں سے واقف تھے. لیکن انسدادی عمل سے بغاوت اور بدنامی کا احتمال تھا. اس کے ماسوا جمال ایسی آگ کا مظاہرہ کر رہا تھا. جس سے خود ان کے قلوب بھی سلگ رہے تھے. بہ الفاظ دیگر وہ انقلابی جدوجہد میں خاموشی سے اس کے شریک تھے

دوپہر کے سناٹے میں جمال نے ہر بیرک کے دو دو چار چار آدمیوں کو یکجا کیا اور جیل کے ایک گوشہ میں مجلس مشاورت منعقد کی. دو آدمی ڈیوٹی پر لگا دیئے گئے کہ جب کسی کو آتا دیکھیں. فوراً اطلاع کریں مگر اتفاق سے کوئی سرکاری آدمی اُدھر نہ گذرا اور جمال کو حسب منشا اپنی اسکیم سمجھانے کا موقع مل گیا اس نے مختصر سے مجمع پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر خطاب کیا.

"دوستو! تم کو حیرت ہو گی کہ میں نے بھری دوپہر میں اس اہتمام کے ساتھ یہ خطرہ کیوں مول لیا. شاید تم سمجھتے ہو کہ میں تم کو فرار کا مشورہ دینے والا ہوں مگر نہیں. قطعاً نہیں. اس قسم کی قانون شکنی سے زنداں کی چہار دیواری میں مقید رہنا ہزار درجہ بہتر ہے. چند روزہ آسائش کے لئے کسی ایسے عمل کا ارتکاب جو دیس کی حالت کو بد سے بدتر بنانے والا ہو کبھی جائز نہیں ہو سکتا میں تم کو وہ باتیں سمجھانے والا ہوں جنھوں نے تم کو اس نوبت پہنچا دیا ہے. آنکھوں سے پردے ہٹا کر تمھارے سامنے وہ راز کھولنا چاہتا ہوں. جن کو

تمھاری سیدھی سادھی عقلیں آسانی سے سمجھ نہیں سکتیں۔ یہ حقیقت ہے کہ
تم میں کی ہر فرد کسی نہ کسی ایسے گناہ کی مرتکب ہو چکی ہے جو انتہائی انسانیت
سوز اور شرمناک ہے۔ تم اس کے لئے پشیمان ہو یا نہ ہو لیکن شروع میں جب
تم نے اس کا ارادہ کیا ہوگا تو تمھارے ضمیر نے ضرور ملامت کی ہوگی۔ اور
تھوڑی دیر کے لئے یقیناً تمھارے قدم پیچھے ہٹ گئے ہوں گے۔ مگر ضروریات
نے پھر حوصلہ دلاکر آگے بڑھایا۔ اور وقتی جذبے کے تحت تم نے اس فعل شنیع
کا ارتکاب کیا۔ مگر یہ عہد بھی کیا کہ جو کچھ ہو گیا وہ ہو گیا آئندہ اس قسم کی حرکت
نہ کریں گے لیکن ضرورت نے پھر مجبور کیا ایکبار پھر فعل کسی قدر آزادی سے
سرزد ہوا آہستہ آہستہ تم اس کے عادی ہوتے گئے اور آج وہ فعل دلیرانہ
طور پر انجام دے سکتے ہو۔ ان افعال کے ذمہ دار تم ہو اور ہمیشہ رہوگے لیکن
پس پردہ بعض ایسی ہستیاں بھی ہیں۔ صحیح معنیٰ میں جن کے ہاتھ تم سے قبل
تمھارے گناہوں میں آلودہ ہیں۔ انھوں نے تم پر ایسی مجبوریاں عاید کردیں کہ
تم چوری کے خوگر بنے یا ڈاکہ کے عادی ہوئے۔ اگر ماحول ایسا نہ ہوتا اور
پیٹ بھر کر روٹی ملتی رہتی تو چوری کرنے کی حاجت ہی کیوں در پیش ہوتی
سرشت انسانی میں اتنا احساس موجود ہے کہ جائز کو جائز اور نا جائز ٹھہرا سکے
میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ وہ تمام افراد جو ایسی شرمناک زندگی گذار رہے ہیں
صرف انھیں حالات میں سارق بنے یا رہزنی کے خوگر ہوئے بلکہ ایسے لوگوں
کی زیادہ تعداد جب محنت مزدوری کرکے بھی فاقہ نہ کرنے پر قادر نہ ہوسکے اور
اس کو کوئی گمراہ کن استاد بھی ہاتھ آگیا تو اس نے ڈرتے ڈرتے ضمیر کی آواز

کے خلاف قدم اُٹھایا اور آباد اجداد کی عزت خاک میں ملادی. سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ممالک جہاں کے باشندے خوشحال اور تعلیم یافتہ ہیں کیا وہاں اس قسم کی واردات نہیں ہوتیں؟ ہوتی ہیں اور ضرور ہوتی ہیں لیکن اس کے وجوہ صرف شکم پری یا ستر پوشی نہیں ہوتے. طمع نفسانی اور حرص زر سے اندھے ہو کر علم وعقل کی روشنی میں وہ دوسروں کی جیب پر ہاتھ ڈالتے ہیں، شاذ ونادر ہی کسی کو فاقہ شکنی کے لئے دیوار پھاندنے کی صعوبت برداشت کرنا پڑتی ہوگی. برخلاف اس کے میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تمھارے چہرے اس وقت تو قید کی تکلیف سے زرد ہیں اور کل آزادی کے دور میں بھوک کی شدت سے کملائے ہوئے تھے. اگر گلزارمین کی حکومت اور کچھ نہیں کرسکتی تو اتنا ہی انتظام کردیتی کہ رعایا تعلیم حاصل کرے یا کوئی ہنر سیکھ کر خود کسب معاش کی اہل ہوجائے. وطن میں نہ سہی وطن سے باہر جاکر سہی زندہ رہنے کا امکان ہوسکتا تھا مگر وہاں کیا ہے؟ اچھی ملازمتیں تو وزیر اعظم کے شناساؤں اور خوشامدیوں سے نہیں بچتیں مذکوریوں جگہیں ہم لوگوں کے لئے خالی ہیں اس میں بھی تنخواہ اتنی قلیل کہ دو دن میں ایک وقت بھی چولھا نہ جل سکے. صنعت کا ایک کارخانہ دکھانے کے لئے ہے. لیکن اغیار کے لئے مخصوص دیس کا کوئی آدمی پاس سے گذر جائے تو تمھارے ساتھیوں میں شمار ہو. اگر ہزار سفارش سے کسی کو کام سیکھنے کی اجازت بھی مل گئی تو کام ایسا سکھایا نہیں جاتا زمانہ جس کی قدر کرے. جہاں تک تجارتی ادارے کا تعلق ہے وہ وزیر اعظم کے بھتیجے کی آمدنی کا ذریعہ ہے. نواب عالیجاہ

کو تو یہ ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ اس میں رعایا کے بہت سے اشخاص برسر روزگار ہو جائیں گے۔ اور سامان کی خریداری میں منافع جو دوسرے حاصل کرتے ہیں ریاست کے خزانہ میں بچ جائے گا لیکن عمل یہ ہے کہ وطن کا کوئی آدمی کارخانہ میں داخل نہیں ہو سکتا بات یہ ہے کہ ایسا کوئی شخص وہاں پہونچ جائے گا تو پردہ پردہ میں جو لوٹ ہو رہی ہے عام لوگوں پر آشکارا ہو جائے گی۔ ان حالات میں میری استدعا یہ ہے کہ دوستو اجب جیل سے چھوٹو تو بجائے اس کے کہ اپنے بھائیوں کا گلا کاٹو کیوں نہ وزیر اعظم کے حلق کا نوالہ چھین کر اپنے ہموطنوں کو کھلاؤ اور خود بھی شریفوں کی زندگی بسر کرو۔"

جمال نے اپنی تقریر ختم بھی نہیں کی تھی کہ مجمع جوش میں چلا اُٹھا،

"ہم وزیر اعظم کی بوٹیاں نوچ کھائیں گے۔ آج ہی دیواریں پھاند کر اس کے بنگلہ پر حملہ کریں گے۔"

لیکن جمال نے ہاتھوں کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کی تلقین کی اور ہر ایک سے فرداً فرداً وعدہ لیا کہ رہا ہو کر سب سے پہلے اس کے مجوزہ پروگرام پر عمل کریں گے۔ اور دوسرے ساتھیوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں گے۔ جلسہ صبر و سکون کے ساتھ برخواست ہوا۔ اور قیدی ایک ایک کر کے اپنی بیرکوں کو چلے گئے۔ اس طرح اس نے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد دوسری میٹنگ۔ پھر تیسری میٹنگ منعقد کی۔ یہاں تک کہ سال بھر کے اندر اندر قیدیوں میں ایک انقلابی روح پھونک دی۔ چارسو آدمیوں

خرافات اور خود غرضی پر محمول کرتے تھے۔ اور بعض نے تو رد و برد نکتہ چینی
کی۔ مگر وہ ہر اعتراض کا جواب نہایت تحمل سے دیتا رہا۔ نتیجہ میں جو نا سمجھ
مخالفت پر کمر بستہ بھی تھے اُن کی زبانیں بند ہوگئیں۔ اور اس کی اسکیم
عملی جامہ پہن کر کمر بستہ ہونے لگی۔

باب ۷
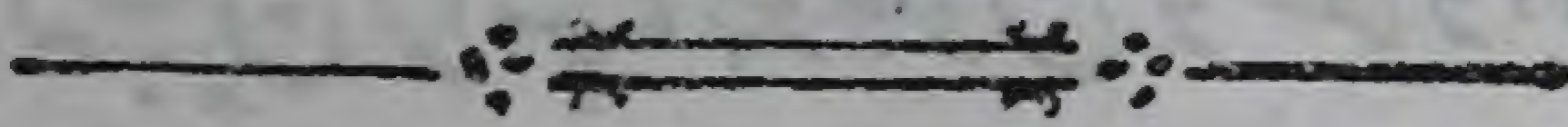
جمال کی اسیری کو آہستہ آہستہ دو سال گذر گئے۔ وہ اپنی فطری جفا کشی اور ساتھیوں کی مدد سے ہر سختی مردانہ وار جھیل گیا۔ مگر قید قید ہی ہے شکل بدل گئی۔ رنگ روپ اُڑ گیا۔ ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے۔ تمام ظاہری خوبیاں جو اس کے مردانہ حسن کی جان تھیں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ اس کو عاصمہ کا خیال اکثر آیا اور اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی۔ عاصمہ بھی کبھی کبھی قیدیوں کو دیکھنے کا بہانہ کر کے اپنے باپ کے ساتھ آتی رہی۔ مگر بجز ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ لینے کے کوئی بات نہ کر سکی۔ جمال نے ابھی ہمیشہ ایسے موقع پر اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا اور نظریں چار نہ ہونے دیں۔

— اتوار کی تعطیل میں وہ ایک ٹاٹ کے ٹکڑے پر لیٹا ہوا ہے۔ عاصمہ کا تصور رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لے رہا ہے

— "بدنصیب عاصمہ! تو نے محبت بھی کی تو ایسے کم ظرف سے جو تیری قدر نہ کر سکا۔ تو نے پیار بھی کیا تو ایسے ننگ خاندان کو جس کی شناسائی جگ ہنسائی کا موجب ہو قید خانے میں تیرے آنے کی غرض میں سمجھتا ہوں اور تیری وضعداری کا اقرار کرتا ہوں۔ تو میری خاطر ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہے۔ مگر افسوس تیرے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے ممکن تھا کہ تیرا قدر ناشناس دل کبھی تیری محبت کا

اہل ہو سکتا۔ اور تیرے تصور کو کلیجہ سے لگانے کے قابل بن سکتا لیکن احساس
رسوائی نے ایسی تمام صلاحیتیں فنا کردیں۔ جی میں آتا ہے کہ تجھ سے کہہ دوں
مگر ہمت نہیں ہوتی۔ پھر یہ سوچ کر اور بھی رُک جاتا ہوں۔ کہ کسی نے بات کرتے
دیکھ لیا تو تیری بدنامی ہو گی"۔

جمال عاصمہ کی خیالی نامرادی پہ نالاں تھا۔ اور خود بخود اپنے دل سے
اُلجھ رہا تھا کہ محمود خاں اس کے ایک ساتھی نے وزیر اعظم کے آنے کی اطلاع
کی۔ کندھئی سنگھ دوسرے ساتھی نے بیان کیا کہ دو عورتیں بھی ساتھ ہیں۔ ایک
تو وہی جو بل کھائی ہوئی لٹیں شانوں پر لہرائے رہتی ہیں۔ اور اس سے قبل
بھی کئی مرتبہ آچکی ہیں۔ دوسری ایک نو عمر لڑکی سی ہیں جنت کی حور معلوم ہوتی
ہیں میں نے دور سے دیکھا تھا۔ رخسارے گلاب کے پھول کی طرح سرخ تھے
آنکھیں دل میں چھبی جاتی تھیں۔ اس پر رہ رہ کر مسکرانا قیامت ڈھا رہا تھا۔
— "کندھئی سنگھ! تم عورتوں پہ نظر ڈالتے پھرتے ہو۔ ابتک اپنی حرکتوں سے
باز نہیں آئے"۔ جمال نے کہا
— "ایشور جانتا ہے بھیا۔ میں نے بُری نیت سے نہیں کہا"۔ کندھئی سنگھ
نے جواب دیا

— محمود خاں بیچ میں بول اُٹھا۔
— "یہ ٹھاکر ہمیشہ سے منچلا ہے۔ آدھی عمر گنوا کر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں"۔
— اب کندھئی سنگھ نے ذرا بگڑ کر کہا۔
— "خاں صاحب تم بھیا کو اور مشکوک کر رہے ہو"۔

—— جمال نے زیرلب مسکرا کر آپس کی نوک جھونک ختم کی۔ اور کندھئی سنگھ سے پوچھا۔

—— "تم کو معلوم ہے وہ ہیں کون اور جیل کیوں آئی ہیں"؟

—— "اس کی بابت مجھے کوئی علم نہ ہو سکا اور نہ میں نے کسی سے دریافت کیا۔ کندھئی سنگھ نے جواب دیا۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بچا جمعدار دوڑتا ہوا آیا اور ہر قیدی کو اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کی تاکید کرنے لگا اس کے پیچھے وزیراعظم اور جیل کا اسٹاف بیرک میں داخل ہوا۔ وزیراعظم کے داہنی طرف عاصمہ اور بائیں طرف ایک نوجوان لیڈی قیدیوں کا معائنہ کرتی ہوئی بڑھی۔ عاصمہ کہنے کو اب بھی خوبصورت اور جوان تھی۔ مگر غور سے دیکھا جاتا تو اس کی حقیقت کمھلائی ہوئی گلی سے زیادہ نہ تھی۔ آنکھوں کے حلقہ اندرونی خلش کا پتہ دے رہے تھے چہرے پر شگفتگی کے بجائے مردنی چھا رہی تھی۔ ہاں نووار خاتون کے حسن کی ضیائیں بیرک کی تاریکیوں کو منور کر رہی تھیں۔ مستانہ روی میں اس کا ہر قدم قیدیوں کو اپنے دل پر پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ نظر جس سمت اُٹھ جاتی۔ انسانی شکلیں نقش بر دیواریں بن جاتی تھیں۔ وزیراعظم صف اول کا معائنہ کرتا ہوا گزر گیا۔ جمال کی نظر اوپر اُٹھی۔ عاصمہ سوگوارانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں ملنا تھیں کہ اس کی آنکھوں سے اشکوں کا دریا اُمنڈ پڑا۔ ہونٹ کانپنے لگے اور حزن و ملال کی یہ تصویر جلد جلد حرکت کرتی ہوئی سامنے سے ہٹ گئی جمال نے ایک دلدوز آہ کر کے آنکھیں پھیر لیں۔ نظریں سراپا جمال خاتون کے

جلوؤں سے دو چار ہوئیں۔ بیساختہ زبان سے نکلا۔

—— "بلا کی مشابہت ہے"۔

—— سر چکرا کر دیوار کے سہارے لگ گیا۔ آہو چشم حسینہ نے بھی شکھی چتونوں سے اس کی طرف دیکھا۔ صورت سے کچھ جذب اور شناسائی محسوس کی جیلر سے دریافت کیا۔

—— "یہ قیدی جو دیوار سے لگا کھڑا ہے۔ کون ہے؟ کچھ صورت آشنا معلوم ہوتا ہے"۔

—— جیلر نے کہا۔

—— "مقامی قیدی ہے۔ آپ نے سفر میں ریل پر یا اور کہیں باہر دیکھا ہوگا"

—— وزیر اعظم بیرک سے جا چکا تھا۔ یہ لوگ بھی باتیں کرتے ہوئے نکل گئے اور جمال کو مضطر و بیقرار بنا کر چھوڑ گئے۔

باب ۸

"گلزارمین" میں نسیم کا دل بہل گیا۔ باپ کی وفات کا رنج کچھ کم ہو گیا
وزیر کی تصنع آمیز باتوں میں وہ بزرگانہ شفقت کی بو محسوس کرنے لگی۔ حالانکہ
زمانہ جانتا تھا۔ کہ مرحوم اختر سے اس کی کوئی خاص قرابت نہ تھی۔ تعلقات
ضرور تھے۔ وہ بھی نواب عالیجاہ کی بدولت قائم ہوئے تھے۔ اختر اپنے گھر
کے رئیس تھے۔ شاہی سے سعد آباد کا تعلقہ ان کے اجداد کا مقبوضہ تھا۔ نواب
عالیجاہ سے اُن کے مراسم تھے اسی توسط سے وزیر اعظم سے بھی شناسائی تھی
اختر کی دونوں بیویاں مر چکی تھیں۔ چالاک وزیر ان رموز سے واقف تھا کہ
بموجب وصیت اختر عالم اور نسیم اختر جائیداد کی وارث ہیں۔ اختر سے تعلقات
ہو جانے کے بعد اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ عزیز داری قائم کر کے عالم اور
نسیم کی جائیداد پہ ہاتھ صاف کیا جائے دنیا ساز وزیر نے سلسلہ کی کڑیاں جوڑ
کر اختر کے خاندان سے اپنے اجداد کا رشتہ قائم کیا اور خاطر و مدارات سے
اخوت کو مستحکم کر لیا۔ کچھ دنوں بعد اختر کی وفات کا حال سُن کر وہ خوشی سے
اُچھل پڑا اور اظہار تعزیت کر کے عالم و نسیم کو بلانے کے لئے خط پر خط بھیجنا
شروع کر دیئے! عالم کی آمد و رفت تو جلد ہی شروع ہو گئی۔ لیکن نسیم باپ کے
غم میں اس حد تک ملول تھی۔ کہ اس نے گھر سے نکلنا تک ترک کر دیا تھا۔ سعد آ

کی کوٹھی میں اپنی وفادار خادمہ سانولو کے ساتھ وقت گذاری کرتی رہی۔ اور
گھر کی دیکھ بھال میں منہمک رہتی۔ عالم جائیداد پر قبضہ پاتے ہی رنگ رلیوں
میں لگ گیا۔ اور سعد آباد ایسے اُجاڑ مقام پر چار روز بھی رہ نہ سکا۔ زیادہ
تر اُس نے "گلزار لین" میں اپنا قیام رکھا۔ اور وزیر اعظم کی حوصلہ افزائی
سے عاصمہ کو اپنانے کی فکر کرتا رہا۔ وزیر اعظم ریاست سعد آباد پر نظریں جما
چکا تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ عالم عاصمہ سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے
تاکہ پھر نسیم کو خورشید سے رشتہ کرنے پر آمادہ کیا جا سکے خورشید اُس کا بڑا لڑکا
تھا۔ اور اسی سال بی۔ اے کی ڈگری لیکر "گلزار لین" میں وارد ہوا تھا۔
عالم تو پہلی ہی بار عاصمہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ اور اس کے برقپاش
تبسم پر مرمٹا۔ جیسا کہ ناظرین جمال اور عالم کی ملاقات کے وقت اندازہ
کر چکے ہیں۔ لیکن عاصمہ کا دل کسی طرح اُس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ وزیر اعظم
نے ہزار ترغیب و تحریص دلائی۔ مگر اس کی طرف سے ہمیشہ انکاری عمل ظہور
میں آیا۔ اس نے اس روش کو جوانی کی ہٹ اور بانکپن کی ادا پر محمول کیا۔
اور عالم کو بھی باتوں باتوں میں سمجھا دیا۔ مگر اس کے سر پر عشق کا بھوت سوار
تھا۔ اس کی ہر گھڑی بغیر عاصمہ کے بے کیف تھی۔ انتظار کی راتیں پہاڑ کی
طرح کاٹے نہ کٹتیں۔ اس نے دل ہی دل میں نسیم اختر کے ذریعہ عاصمہ کو رام
کرنے کی اسکیم بنائی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کو نسیم سے یہ اُمید نہ تھی کہ وہ
صرف اُس کے کہنے سے سعد آباد سے چلی آئے گی! عالم کو اپنے پچھلے برتاؤ
کا احساس تھا۔ باپ کی زندگی سے وہ اس کی آنکھ میں خار کی طرح کھٹکتی

تھی۔ اس نے اس کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ مگر ہر حربہ بیکار اور ہر وار خالی گیا تھا۔ نسیم ان باتوں سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اور ہر وقت اُس سے چوکتا رہتی تھی۔ اس لئے اُس نے وزیر اعظم کو اُبھار کر بھیجا۔ اور نسیم کو ہمراہ لانے پر مجبور کیا وزیر اعظم کے جامے سے وہ انکار نہ کر سکی۔ اور اُس کو کچھ دنوں کے لئے گلزار مین آتے ہی بن پڑا۔ نسیم آئی۔ خورشید کو بے مانگے مراد ملی۔ مگر تجربہ میں اس نے ہر گھات پر مات کھائی چالاک باپ کے حریص بیٹے نے اظہار تمنا کی نئی نئی صورتیں تراشیں مگر روبرو ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت نہ کر سکا عالم کو اپنے مقصد میں کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوئی۔ عاصمہ کا زیادہ وقت نسیم کی صحبت میں کٹنے لگا۔ اور اُس کو بھی درمیان درمیان بات کرنے کا موقع نصیب ہوتا رہا۔

جیل سے واپس آکر نسیم عجب کشمکش میں مبتلا رہی۔ جمال کی بھولی شکل اس کی نگاہوں میں پھرنے لگی۔ بار بار اُس کو خیال آیا۔

"میں نے اس کو دیکھا ہے۔ ہو نہ ہو یہ وہی نوجوان ہے۔ جس نے دریا کے کنارے میری جان بچائی تھی۔ ہائے صورت ہے۔ کہ دل پر نقش ہو جائے اور افعال ہیں کہ جیل کی چہار دیواری میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے نگاہیں قلب میں اُتری جا رہی تھیں۔ جی میں آتا تھا۔ نزدیک جا کر کوئی بات کروں اور پوچھوں کہ اے بد اعمال یہ شکل خدا نے اسی لئے دی تھی۔ کہ تو اس کو یوں برباد کرے تجھکو تو کسی مندر میں دیوتا بن کر بیٹھنا چاہیئے تھا۔ کہ میری سی غمزدہ عورتیں محبت کی بھیک پائیں نہ کہ قیدخانہ کی تنگ و تاریک

کوٹھری میں جہاں کوئی حسن و شباب کا پوچھنے کا والا نہیں۔ مگر نسیم ! میلے کچیلے
کپڑوں میں بھی اُس کی پیشانی درخشاں تھی دل کہہ رہا تھا کہ وہ مجرم نہیں۔
قیدیوں کی پوشاک میں بھی اس کی بے گناہی ٹپک رہی تھی۔ مجھکو دیکھکر
اس نے کہا تھا دلبلا کی مشابہت ہے" شاید وہ مجھے پہچان نہ سکا۔ مگر میرا
خیال ہے۔ وہ مجھکو کیا جانے مجھے جنون ہوگیا ہے۔ کہ ایک ادنٰی قیدی کے
متعلق اتنا سوچ رہی ہوں"
—— نسیم اپنے دل کو سمجھا بجھا کر شکوک رفع کر رہی تھی۔ مگر اس کی یاد یقین
دلا رہی تھی کہ یہ وہی نوجوان ہے۔ جس کا خیال آج تک سوتے جاگتے اس کا
غمخوار رہا۔

اسی الجھن میں سہ پہر ہوگئی۔ اور عاصمہ اور خورشید نے آکر اس کے
خیالات کو منتشر کر دیا عاصمہ تو عالم کو دیکھنے چلی گئی۔ اس کی طبیعت دو
تین دن سے خراب تھی۔ خورشید کو تنہا اظہار جذبات کا موقع مل گیا وہ
بغیر کچھ کہے سنے اُٹھا اور دوزانو ہوکر نسیم کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ نسیم ایک
کوچ پر پیر لٹکائے نیم دراز تھی۔ خورشید نے دونوں ہاتھوں سے اس کے
پیر پکڑ کر کہنا شروع کیا۔

"پیاری نسیم خورشید مدت سے تمھارے تصور کو سینے سے لگائے ہے
صرف اس اُمید پر کہ شاید کبھی تمھاری بے اعتنائی توجہ سے بدل جائے
اور اس کے حال پر کچھ رحم آجائے۔ مگر تم نے ہمیشہ بے رخی کو اپنا شیوہ قرار
... تمنا کا موقع نہ دیا ہزار بار جسارت کرنے کی

کوشش کی مگر تمھارے برہم تیوروں نے حوصلہ پست کر دیا آج نتیجہ سے بیخبر ہو کر دربار حسن میں ہاتھ پھیلا دیئے ہیں۔ خدا کے لئے مایوس نہ کرنا اور ایک سائل سمجھ کر سہی قدموں سے لپٹے رہنے کی اجازت دیدینا۔"

——نسیم عالم تحیر میں خورشید کو دیکھتی رہی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا جواب دے۔ خورشید کے خاموش ہو جانے پر دہ پیر سمیٹ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

——"خورشید صاحب یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ انسان کو کسی حال میں اتنا گرنا نہ چاہیئے آپ کی میری ملاقات کو ابھی کے دن ہوئے ہیں اور بفرض محال اب پہلے سے بھی مجھکو جانتے ہوں تو اس قسم کا اظہار انتہائی بے تکلفی کے بعد ہو سکتا ہے۔ نہ میں آپ کو سمجھ سکی۔ نہ آپ میرے متعلق کچھ غور کر سکے اور آپ نے زندگی کی وابستگی کا مسئلہ اُٹھا دیا۔ جانے آپ کی محبت کس قسم کی ہے۔ جس نے اس حد تک از خود رفتہ کر دیا ہے۔ اور اتنی جلد ہوش و حواس مختل کر دیئے ہیں۔ اگر آپ میں خودداری باقی نہیں۔ تو تمام دنیا اس سے عاری نہیں ہو گئی۔ پھر محبت کوئی حود اختیاری سے نہیں۔ جو کہنے سننے سے دل میں پیدا ہو جائے ہاں میں نے بھی کبھی اس قسم کا کوئی جذبہ محسوس کیا تو آپ کی قدردانی کی مشکور ہوں گی۔"

——نادان خورشید نے نسیم کی اس گفتگو کو ہر پہلو سے اپنے موافق سمجھا اور قدموں کا بوسہ لے کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

نسیم کوچ سے اُٹھی اور عاصمہ و عالم کے استقبال کو بڑھی۔ کیونکہ

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اسی طرف کو آرہے تھے۔ اس نے پکار کر عالم سے کہا

—— "میں خود آنے والی تھی۔ آپ نے کیوں اتنی زحمت کی"؟

—— عاصمہ بول اُٹھی

—— "ٹہلنے سے کسل دور ہو جائے گا۔ اور طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی"

—— عاصمہ کا منشار پاکر نسیم نے ہوا خوری کی تجویز کی اور سب کے سب آہستہ آہستہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئے۔
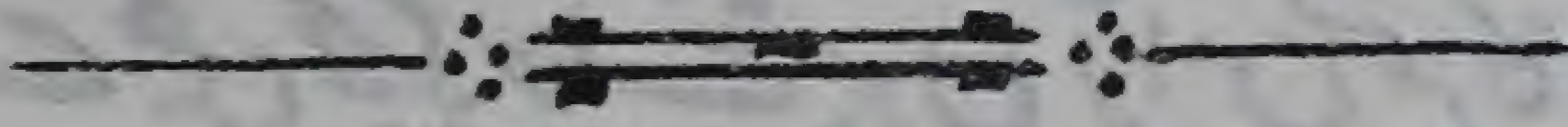
باب ۹

دیواروں سے زنداں کی اور عشق کا افسانہ
سودائی تو سودائی دیوانہ تو دیوانہ

وزیر اعظم کے معائنہ کے بعد سے جمال کو اپنا دل ڈوبتا ہوا معلوم ہوا لاکھ طبیعت کو سنبھالا. مگر حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی ہی گئی. محمود خاں نے کہا بھی "بھیا تمھارا چہرہ دوپہر سے کچھ اُترا ہوا ہے. کیا خدانخواستہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

لیکن اس نے بہانے سے بات بنا دی کہ گرمی سے سر میں درد ہو رہا ہے جاتا رہے گا. مگر اس کے ذہن سے ایک لمحہ کے لئے بھی نسیم اختر کا تصور نہ جا سکا. بار بار یہ خیال آتا رہا.

"کس غضب کا حسن پایا ہے ظالم نے. کلیجہ میں اک آگ سی لگا دی صورت پہچانی ہوئی ہے. یہ وہی حسینہ ہے. جس کو میں نے دریا کے کنارے دیکھا تھا. ناک نقشے اور رنگ وروپ میں تو کوئی فرق نہیں. ہاں یہ حسن افروز ملاحت. یہ توبہ شکن ادائیں اُس کمسن دوشیزہ میں نہ تھیں. وہ یہاں آتی ہی کیوں؟ اس سے وزیر اعظم کا تعلق کیا؟ مگر ہاں وہ عالم کی بہن ہے اور عالم کی

وزیراعظم سے قرابت ہے۔ میری طرف اشارہ کرکے جیلر سے کچھ پوچھ بھی رہی تھی۔ اس سے قبل دیکھا نہیں تو استفسار کی وجہ کیا؟ کسی دوسرے قیدی کو نہ پوچھا۔ مجھ میں کیا خصوصیت تھی۔ شاید وزیراعظم نے کہا ہو۔ لیکن وہ ایسی غلطی نہیں کرسکتا کہ خود اپنے مظالم کا بیان کرکے کسی کو شاہد بنائے۔ جمال! اگر یہ وہی ہوئی تو میرے متعلق کیا خیال کرتی ہوگی۔ مجھکو بھی چور یا ڈاکو سمجھ کر انھیں لٹیروں کا ہم پیشہ قرار دیا ہوگا اور سمجھ لیا ہوگا کہ میں نے کسی مصلحت سے اس کو بچا لیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجھکو بھول گئی ہو۔ اور سب سے نوعمر دیکھ کر جیلر سے کوئی بات دریافت کرلی ہو۔ یہاں آئی تھی۔ وقت گزاری کے لئے کوئی نہ کوئی بات کرنا تھی۔ بفرض وہ مجھے نہ پہچانتی ہو یا بھول گئی ہو تو کیا میں اس کو بھلا سکوں گا"؟

اس سوال پر اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگتا اور وہ رنج و راحت کی مشترکہ کیفیت سے ڈوب جاتا۔ گھنٹوں گزر گئے اور اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ کندھئی سنگھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ پوچھ بیٹھا۔

کیا بات ہے۔ بھیا۔ اُس وقت سے خاموش کیوں ہو؟ کوئی ایسی ہی مشکل ہے تو ہم لوگوں سے کیوں نہیں کہتے کیا ہمارے اوپر بھروسہ نہیں ہے؟

مگر جمال موضوع بدل کر کہنے لگا۔

"میرے لئے تم سے زیادہ قابل اعتبار اور کون ہوسکتا ہے۔ میں غور یہ کررہا تھا کہ میری رہائی میں صرف چند روز باقی ہیں۔ تم لوگوں میں سے کوئی مہینہ بھر بعد کوئی دو مہینہ بعد چھوٹے گا۔ اس سے پہلے ہی مجھے تمام مراحل

طے کرلینا ہیں۔ وطن کی بے حس رعایا کو ستیہ گرہ پر آمادہ کرنا ہے۔ تم جانتے ہو کہ صدیوں کی غلامی سے کسی میں خودداری باقی نہیں رہی۔ ظلم سہتے سہتے احساس مظلومیت بھی فنا ہو چکا ہے۔ ایسے لوگوں میں جان ڈال کر سوئے ہوئے جذبات بیدار کرنا ہیں۔ چند نوجوان ساتھ ضرور ہوں گے مگر تنہا ان کی آواز صدا بصحرا سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ میرا پروگرام ہے کہ جیل کے ساتھیوں کے آنے سے قبل کام شروع کر دوں۔"

"اس میں سوچ بچار کی کون سی بات ہے۔ اگر دیکھئے گا کہ دِقت پڑ رہی ہے تو ہمارے آنے تک ملتوی رکھئے گا۔" کندھئی سنگھ نے کہا۔

"اتوار میں ہرج تو نہیں ہے۔ مگر وقت ضائع ہو گا۔ جو کام آج ہو سکتا ہے وہ کل پر کیوں چھوڑا جائے۔ جمال نے جواب دیا۔

"تو پھر ایشور کا نام لے کر شروع کر دیجئے گا۔ بنانے والا وہی ہے۔" کندھئی سنگھ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"انشاء اللہ۔ ایسا ہی ہو گا۔ مگر میں پھر کہے دیتا ہوں کہ میرے سامنے سے ہٹتے ہی کہیں تمھارے ارادے بدل نہ جائیں اور میری اتنے دنوں کی محنت خاک میں مل جائے۔" جمال کی بات پوری ہونے سے قبل محمود خاں کہنے لگا۔

"بھیّا! معلوم ہوتا ہے کہ آپ آگے چلنے پر تیار نہیں ہیں۔ ورنہ اس قسم کی باتیں نہ کرتے۔ آپ نے ہم کو راہ پر لگا دیا۔ ہماری زندگیوں کو سدھار دیا۔ اس کے لئے ہم آخری سانس تک مشکور رہیں۔ ظالم حکومت کے خلاف

آواز بلند کرنے کی سکت ہمارے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ آپ کی رہنمائی حاصل ہو گئی تو کام خوش اسلوبی سے ہو جائے گا۔ ورنہ جس طرح ہو سکے گا ہم اپنے حقوق کے مطالبہ میں کمی نہ کریں گے"

سب نے محمود خاں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جمال شاداں و فرحاں دوستوں کے مجمع سے اُٹھا۔ اور پھر اپنے ٹاٹ پر لیٹ کر نسیم اختر کے خیال سے باتیں کرنے لگا۔

باب ۱۰

عاصمہ! اُس دن جب میں تمھارے ساتھ جیل دیکھنے گئے تھی تو ...
کی بیرک میں ایک جوان قیدی دیکھا تھا وہ کون ہے؟ شکل وصورت سے
کوئی شریف معلوم ہوتا ہے"۔ نسیم نے دریافت کیا۔
"دیکھا میں نے بھی تھا۔ مگر کسی سے پوچھا نہیں"۔ عاصمہ نے جواب
دیا۔ مگر اس کی آواز ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے سانس
روکنے کی بہت کوشش کی مگر تنفس کی تیزی سے نسیم نے مشکوک ہو کر کہا۔
"بہن۔ تمھاری صورت کہہ رہی ہے کہ تم کو معلوم ہے مگر بتاتے ہچکچاتی ہو
"عاصمہ کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ دل بھر آیا۔ آنکھوں سے
آنسو بہنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر نسیم اور بھی متحیر ہوئی۔ اور کہنے لگی۔
"ارے اس میں رونے کی بات کیا ہے۔ میں تو اس قیدی کا حال
پوچھ رہی ہوں۔ تم کو رنج ہوتا ہے تو نہ پوچھوں گی"۔
"نسیم تم اس کو نہیں سمجھ سکتیں"۔ عاصمہ نے جواب دیا۔
"تمھاری باتیں تو بالکل معمہ ہیں۔ میں پوچھ کر الجھن میں پڑ گئی"۔ نسیم
نے روٹھتے ہوئے کہا۔
بُرا مانتی ہو تو بتائے دیتی ہوں۔ مگر نہیں۔ مجھے تم سے نہ کہنا چاہیے۔

تم عالم کی بہن ہو"۔
عاصمہ کو اس طرح پس و پیش کرتے دیکھکر نسیم نے اس کو یقین دلایا کہ وہ اُس کے راز کو ہمیشہ سینے میں محفوظ رکھے گی اور کسی حال میں افشار نہ کرے گی مطمئن ہو کر عاصمہ نے کہنا شروع کیا۔
"اُس نوجوان کو پہلی دفعہ میں نے شاہی پارک میں دیکھا تھا۔ نسیم دل ہی تو ہے۔ قابو میں نہ رہا۔ میں نے اُس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی دو تین دن تک وہ مقررہ وقت پر آتا رہا۔ مگر اس کے بعد اس نے ہوا خوری بھی ملتوی کردی۔ ایک مرتبہ میں عالم کے ساتھ تفریح کو جا رہی تھی۔ وہ ایک باغ میں پپیہے کی آواز پر آواز لگا رہا تھا۔ عالم اس کو دیکھکر فٹن سے اُتر پڑا۔ اُن کی آپس میں کوئی رنجش تھی۔ اُس موقع پر عالم نے اس کو ذلیل کرنا چاہا۔ کیونکہ اس نے ریاست کے دفتر میں کلرکی کی معمولی ملازمت کرلی تھی۔ مگر وہ اپنی خودداری کو چھوڑ نہ سکا۔ ناخوشگوار گفتگو کی نوبت آئی عالم نے واپس آکر ابا جان سے شکایت کردی۔ ابا جان نے اس کو بلوا کر ملامت کی۔ وہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکا اور سخت کلامی کی علت میں سزایاب ہو کر ۲ دو سال کے لئے جیل بھیجدیا گیا"۔
"رہائی کی کوشش نہیں کی تم نے"؟ نسیم نے پوچھا
کی کیوں نہیں۔ میں نے ابا جان کو بہت سمجھایا کہ بیجا ظلم نہ کیجئے۔ اس سے زیادہ میں کر ہی کیا سکتی تھی عاصمہ نے جواب دیا" وہ راضی ہو گئے تھے۔ مگر اس نے معافی مانگنے سے انکار کردیا۔ اور کہلا بھیجا کہ

"عزت کی موت اچھی ذلت کی زندگی سے"

"تو اس غریب پر یہ مصیبت عالم کے ہاتھوں نازل ہوئی۔ عاصمہ یقین مانو کہ اس سے میری جو نہیں بنتی۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس کے پاس دل نہیں پتھر ہے۔ وہ انسان نہیں درندہ ہے۔"

نسیم نے اظہار خیال کیا لیکن عاصمہ توجہ دیئے بغیر کہتی رہی "میری زندگی تباہ ہوگئی۔ عالم اس فکر میں ہے کہ مجھ سے شادی کرلے مگر میری محبت ہے کہ دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ اور عالم سے نفرت کا جذبہ اُبھر رہا ہے۔"

"کام تو انھوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ کیا اُن کو تمھاری اور اس کی محبت کا علم نہیں۔"

نسیم کے سوال پر عاصمہ نے کچھ توقف کیا اور پھر کہنے لگی۔
تمھارے علاوہ آج تک کسی اور سے ذکر نہیں کیا۔ ذکر کرتی بھی تو کس اُمید پر۔ جمال صورت دکھانے کا روادار نہ تھا۔ میرے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ محبت رنگ لائے گی۔ اور اس کو اقرار کرنا پڑے گا مگر آہ میری آرزوئیں خاک ہوگئیں۔ جیل سے رہائی کے بعد وہ مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کرے گا جس وزیر اعظم کی بدولت اس کو یہ صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ میں اُسی کی بدقسمت بیٹی ہوں۔"

اتنا کہکر عاصمہ نے ایک جگر دوز آہ کی نسیم کا کلیجہ ہل گیا۔ اور آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ کچھ تو عاصمہ کی روداد غم پر اور زیادہ تر اس لئے کہ اس کا

دل خود بخود اُمنڈنے لگا تھا۔ اُس نے ضبط کرکے پوچھا

"عاصمہ۔ جانتی ہو۔ وہ ہے کون"؟

"اس کے باپ یہیں کے رہنے والے تھے۔ عرصہ ہوا اُن کا انتقال ہوگیا۔ وہ بچپن ہی سے حصول تعلیم کے لئے وطن سے چلا گیا تھا۔ اور عالم کے ساتھ ہی۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اسی زمانے میں اس نے عالم کو سکریٹری شپ میں الکشن میں شکست دی تھی۔ عالم کے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی۔ اس نے اس موقع پر دل کا کینہ نکالا" عاصمہ نے بیان کیا۔

"کیا وہ عالم کے ساتھ ہی زیر تعلیم تھا"۔ نسیم نے مضطرب ہو کر پھر دریافت کیا

"شروع سے آخر تک اُس کے ساتھ رہا"

عاصمہ کا جواب سُن کر نسیم کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اور اندرونی کرب کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ وہ خاموشی سے اُٹھی اور کمرے کے باہر نکل گئی۔ عاصمہ سر جھکائے خیالی آسمانوں کی پرواز کرتی رہی۔ اس کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ نسیم کب اُٹھی کب گئی گھنٹوں کے بعد جب ہوش آیا تو اس نے نسیم کو نہ پایا۔

نسیم چلنے کو تو چل رہی تھی۔ مگر اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے بمشکل وہ دروازے تک پہنچی اور پیٹ پکڑ کر اندر داخل ہوئی بمشکل چڑھا کر پلنگ پر اس طرح گر پڑی جیسے کسی نے ہزاروں کوس کی منزل طے کی ہو۔ اس کے منھ سے کئی بار یہ جملے نکلے۔

"میرے محسن۔ آہ۔ تجھ پر یہ مصیبت!"
تکیہ اشکوں سے تر ہو گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور دل کی بھڑاس نکال کر کچھ سوچنے کے قابل ہو سکی۔
"تیرا نام جمال ہے۔ تو نے میری عصمت بچائی تھی۔ مگر میری کا ہے کو؟"
نسیم نے دانتوں کے نیچے انگلی داب لی اور آپ ہی آپ شرما گئی۔
"میں نے اُسی دن کہا تھا، کہ یہ شکل تو وہی ہے جس کے تصور نے اکثر میری راتوں کو پر کیف بنایا ہے۔ پانچ سال کی بات ہے جب میں عالم کو دیکھنے گئی تھی۔ اور تو نے احسان کر کے ہمیشہ کے لئے مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ گو مجھ میں محبت کا مفہوم سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی مگر وہ خوشگوار خلش جس کو محبت کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھی غیر شعوری طور پر محسوس کرتی تھی"۔
بے گناہ جمال! عالم نے تجھ پر ستم توڑے۔ نسیم اس کی بہن ہے۔ دوسری ماں سے سہی لیکن خون تو ایک ہی ہے۔ کہیں اس کے ساتھ مجھ سے بھی بدگمان نہ ہو جانا۔ مگر نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس دن مجھکو دیکھکر تیرے منھ سے بھی آہ نکلی تھی شاید تجھکو بھی میرا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ افسوس غریب عاصمہ۔ تیرا کیا حشر ہو گا۔ تو نے مجھکو راز دار بنایا ہے۔ میں تیری حق تلفی نہیں کر سکتی۔ میری رگوں میں شرایف خون ہے۔ تیرے ساتھ فریب کرنا میرا شیوہ نہیں ہو سکتا تو دل سے مجبور ہے اور میں بھی اسی محبت کو مدت مدید سے پہلو میں دبائے بیٹھی ہوں اللہ کیا کروں۔ عاصمہ مجھکو کیا کہے گی اچھا عاصمہ میں اپنی طرف سے اقدام نہ کروں گی۔ تو خود کہتی ہے کہ اُس

تجھ سے محبت کا وعدہ نہیں کیا۔ اگر وہ تجھکو چاہے گا۔ تو میں اپنی زندگی اس کا نام لے کر گذار دوں گی۔ مگر تیری بنتی ہوئی دنیا بگاڑنے کی سعی نہ کروں گی۔ میرے ارمان پامال ہوں۔ میری حسرتیں خون ہوں۔ عاصمہ تیرے دل کی مرادیں پوری ہو جائیں تو نسیم کی نامرادی عین مراد ہوگی؛

اس نے دل ہی دل میں عہد کیا۔ اور جمال کے متعلق تمام واقعات کو جو پہلی ملاقات سے اس وقت تک ظہور پذیر ہوئے تھے۔ یکجا کرتے کرتے خواب شیریں کے مزے لینے لگی۔

باب ۱۱

یہ وہی رات تھی جو کرامت حسین نے آنکھوں آنکھوں میں کاٹ دی آسمان پر تارے دیکھتے دیکھتے افق مشرق پر سپیدہ سحر نمودار ہوگیا۔ وہ بستر سے اُٹھے۔ نماز پڑھی۔ بیوی کو جگایا۔

"اُٹھو۔ سویرا ہوگیا۔ بچوں کو منہ ہاتھ دھلا دو۔ میں تانگہ لاتا ہوں۔ تاکہ رہائی سے پہلے جمال کے بھائیوں کو لے کر جیل کے پھاٹک پر پہنچ جاؤں" یہ کہکر وہ دروازے سے باہر نکلے۔ محلہ کے ایک تانگہ کو طے کیا۔ اور مکان واپس آئے۔ وحید و سعید فرط مسرت سے صحن در دروازہ پر قلانچیں بھر رہے تھے۔ بھائی جان کے آنے کی خبر سُن کر چہروں پر تازگی سی آگئی تھی۔ رگوں میں خون کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ سعید کی عمر ۹ سال سے زائد نہ تھی۔ وحید بارہ سال کے قریب تھا اور کچھ سمجھنے کے لائق تھا۔ کرامت حسین نے بڑھ کر دونوں کو گود میں اُٹھایا۔ اور اگلی سیٹ پر سوار کیا خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور تانگہ جیل کی طرف روانہ ہوگیا۔ جیل کے پھاٹک پر غیر معمولی مجمع تھا۔ شہر کی نوجوان پارٹی میں انتظار میں کھڑی تھی۔ کچھ غریب پیشہ ور چند دوکاندار جو جمال کے اخلاق سے اس کی محبت کا دم بھرتے تھے ایک گوشہ میں کھڑے وزیر اعظم کے مظالم کا تذکرہ کر رہے تھے۔ کرامت حسین

بھی انھیں لوگوں میں شامل ہو کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔
قید خانے میں جمال ایک اک قیدی سے گلے مل کر آہستہ آہستہ چلا گریہ کی بلند آوازوں میں کسی جوانا مرگ کے جنازے کی طرح وہ گیلری تک پہنچا۔ قیدی وہاں پر رُک گئے اس نے مڑ کر یاس انگیز نظر سے سب کو الوداعی سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔ پھاٹک میں جیل کے کپڑے اُتار کر اپنی پوشاک پہنی۔ سنتریوں نے کھڑکی کھولی اور وہ باہر گیا۔
آزادی کی فضا میں اس کا سب سے پہلا قدم غریب بھائیوں کی طرف اُٹھا۔ اس کے بعد احباب و اقربا سے مل کر فرماں بردار بھتیجے نے چاہنے والے چچا کی آغوش میں محبت پدری کا لطف حاصل کیا۔ وحید وسعید کو گود میں لے کر پیار کیا اور آنے والوں کے خلوص کا شکریہ ادا کر کے چچا کے ساتھ ساتھ مکان کی طرف راہی ہوا۔ مجمع زیادہ تھا۔ پا پیادہ چلنا قرار پایا۔ آگے آگے جمال اور کرامت حسین۔ پیچھے پیچھے باقی تمام افراد سڑک پر چلنے لگے۔ کچھ دور پر وزیر اعظم کی فٹن مخالف سمت سے آتی دکھائی دی۔ یہ لوگ ایک کنارے ہو گئے۔ مگر فٹن بجائے گزر جانے کے قریب آ کر ٹھہر گئی اور عاصمہ اور نسیم اختر اُتر کر جمال کی طرف بڑھیں عاصمہ کے ہاتھ میں سفید پھولوں کا ہار تھا۔ جو اس نے اپنے ہاتھ سے گوندھ کر تیار کیا تھا۔ جمال کے قریب آ کر اس نے وہ گلے میں ڈال دیا۔ اور شکریہ کا موقع دیئے بغیر فٹن پر سوار ہو کر روانہ ہو گئی۔ نسیم نظر نیچی کئے کھڑی رہی اس نے نہ کسی کی طرف دیکھا اور نہ کسی سے کوئی بات کی۔ مگر زمانہ اس کو

شوق کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اور رفتن جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی نگاہیں برابر اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ جمال عاصمہ کی پرخلوص نذر سے دل ہی دل میں مسرت اور شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ چچا کی موجودگی میں اس کا اظہار محبت شرم سے پانی پانی کئے دیتا تھا کرامت حسین دوسرے لوگوں کی طرح استعجاب میں تھے۔ کہ وزیر اعظم جس کی دشمنی کی پاداش میں جمال کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ اُسی کی بیٹی اس موقع پر شریک مسرت ہو ایک عقدۂ لاینحل تھا جس کو اُن کی سیدھی سادھی عقل سمجھ نہ سکتی تھی۔ مگر انھوں نے جمال سے کچھ نہ کہا اور اپنی بزرگی ملحوظ رکھتے ہوئے بات چیت مناسب نہ سمجھی۔ مکان آگیا۔ جمال دوڑ کر اندر داخل ہوا اور چچی کے قدموں سے لپٹ گیا۔

باب ۱۲

"گلزار یمن" کے گوشہ گوشہ سے انقلاب کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں بازار کے قریب ہی ایک کشادہ مکان میں انقلابیوں کا دفتر قائم کیا گیا تھا۔ اس کے پیش دروازہ روزانہ شام کو شہر کے نوجوان یکجا ہو کر ظالم حکومت کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو محکومیت پسند رعایا خود ہی مخالف بن کر سامنے آئی۔ مگر جمال کے استقلال اور شان مظلومیت کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔ اور ہر چھوٹے بڑے کو سر تسلیم خم کر دینا پڑا۔ یہاں تک کہ کرامت حسین کے سے ضعیف اور وحید کے سے ناتواں مرد میدان بن کر استبداد کے پہاڑوں سے سر ٹکرانے پر کمر بستہ ہو گئے۔

جمال نے اس کی احتیاط کی تھی کہ کوئی غیر آئینی عمل ظہور میں نہ آئے۔ جس سے جڑ مضبوط ہونے سے قبل حکومت کو سر کچلنے کا موقع مل جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مظالم کے مقابلہ میں قربانیاں کیسے بغیر کامیابی ہونا ممکن نہیں۔ پھر بھی اس نے یہ اصول نظر انداز نہ کیا۔ کہ میدان عمل میں آنے سے قبل جماعت پوری طرح مرتب و منظم ہو جائے۔ تاکہ ایک کی عدم موجودگی میں دوسرا صحیح رہنمائی کر سکے۔ اور دوسرے کے بعد تیسرا

قائمقام بن جائے۔ عجلت میں بنابنایا کام بگڑ جانے کا احتمال تھا۔ اور یہ خیال اپنی جگہ پر تھا بھی درست۔ اگر ایک مرتبہ بھی ابتری پھیل جاتی پھر اس کا سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کو اپنے جیل کے ساتھیوں کا بھی انتظار تھا۔ محمود خاں اور کندھئی سنگھ کی رہائی میں صرف چند روز باقی تھے۔ عزیزالدین اور رام پرکاش جو آزادی کی جدوجہد میں اس کے دست و بازو تھے۔ ان دونوں کی رائے تھی کہ کم ازکم اپنے مطالبات کو نواب عالیجاہ کی خدمت میں پیش کردینا چاہیئے۔ اس میں ہفتہ عشرہ صرف ہوگا۔ جب تک جیل کے ساتھی بھی آجائیں گے۔ مگر وہ امروز فردا پر ٹالتا رہا۔ اس روش پر اس کے متعلق بدگمانی بھی کی گئی کہ وہ عاصمہ کے ذریعہ حکومت سے مل گیا ہے۔ ہارپنھانے کا واقعہ بچے بچے کو معلوم تھا مگر جمال نے کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ہر اعتراض کو شکریہ کا دامن پھیلاکر قبول کیا۔ ایک ہفتہ کے اندر کندھئی اور محمود خاں کے ہمراہ جیل سے پچاس آدمی رہا ہوکر اس کی انجمن میں شریک ہوگئے۔ تو اس نے مطمئن ہوکر رام پرکاش سے کہا کہ کل سہ پہر کو پبلک کو نواب عالیجاہ کے دربار میں اپنی عرضداشت پیش کرنا چاہیئے۔

وقت مقررہ سے پہلے ہزاروں آدمیوں کا مجمع دفتر کے صحن میں نظر آنے لگا۔ میدان میں ڈاؤڈ اسپیکر نصب کئے گئے تھے۔ جگہ کی قلت اور آدمیوں کی کثرت سے کان پڑے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ٹھیک چار بجے جمال اسٹیج پر آیا اور دونوں ہاتھوں سے وطنی بھائیوں کو سلام کر کے

خطاب کیا۔

"میرے بزرگو اور بھائیو! آپ کو اس اجتماع کی غرض اور غایت تو معلوم ہی ہے۔ اس کے متعلق مجھکو کچھ عرض کرنا نہیں۔ البتہ اپنے مجازی مالک کے روبرو اپنی تکالیف کا جو اظہار کرنا ہے۔ اور اس کے ازالہ کی استدعا پیش کرنا ہے اُسی پر مختصر سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں"۔

"موجودہ وزیر اعظم نے بربادیوں کے جو سامان کئے۔ اور مصیبتوں کے جو پہاڑ سروں پر ڈھائے وہ سب آپ کے جھیلے ہوئے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بیس پچیس سال کے اندر "گلزارِ زمین" کے باشندے جن تباہیوں سے دوچار ہو چکے ہیں اس کی مثال کسی خطۂ ارض میں نہیں مل سکتی۔ ہماری حالت اب اس درجہ سقیم ہو چکی ہے کہ اگر نواب عالیجاہ توجہ کریں تو بھی پنپتے پنپتے صدیاں گذر جائیں گی۔ مگر یہ صرف دل کا بہلاوہ ہے۔ ان کو ایسا ہی خیال ہوتا تو یہ دن کاہے کو دیکھنا پڑتے اور ہمارے گھروں کے چولھے صرف ایک بار جل کر چوبیس ۲۴ گھنٹوں کے لئے خاموش کیوں ہو جایا کرتے۔ میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری سلطان ذی پناہ پر ہے بلکہ اُن سے تغافل کی شکایت ہے کہ انھوں نے جلتے ہوئے گھروں سے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ وزیر کی قرابت کا اتنا خیال کہ رعایا خاک میں ملتی رہی اور ابرُوں پر شکن نہ آئی اگر ہم چھوٹے ہیں۔ کمزور ہیں۔ ہم کو جھکنا پڑے گا اور ان تمام باتوں کو بھول کر دستِ سوال پھیلانا پڑے گا۔ یہ وہ عرضداشت جو آپ حضرات پیش کریں گے

پڑھ کر سناتا ہوں اور منظوری کا مستدعی ہوں۔"

"گلزار یمن کی فاقہ کش رعایا کی فریاد نواب عالیجاہ کی سرکار میں"

"ہم آج آخری بار اپنی داستان دربار جلالت پناہ میں دہرانے کو حاضر ہیں گو یہ جانتے ہیں کہ ہم کو دروغ گو اور مکار ٹھہرا کر باریابی کا موقع بھی نہ ملے گا۔ مگر نمکخوار کی حیثیت سے ہمارا فریضہ ہے کہ پانی سر سے اونچا ہو جانے سے قبل ناخدا کو آواز دیں۔ اور اُبھرنے کی امکانی سعی کریں۔ ہاتھ پیر تو فطری طور پر چلیں گے اور بچاؤ کے لئے تنکے کا سہارا ملے گا تو ڈوبنے والا ذرا پس و پیش نہ کرے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ان تنکوں کے حصول کی جد و جہد میں کشتی تھپیڑوں کی زد میں آ کر بیٹھ جائے اور ناخدا کو کچھ نقصان پہنچے۔"

"ہمارے مجازی مالک کو اگر علم نہیں ہے تو ہم بیان کرتے ہیں کہ ہمارے گھروں میں لٹیرے گھر والے بن کر دھنس رہے ہیں۔ اور ہم گھروں سے باہر باپ دادا کی چوکھٹ سمجھ کر زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ مگر وہاں بھی سکون سے رہتے نہیں پاتے۔ سب سے زیادہ مصیبت تو یہ ہے کہ وہ لٹیرے خود سرکار کی پناہ میں ہیں فریادی بن کر جائیں تو کہاں؟ اگر خود اُن کے نکالنے کا انتظام کریں تو نمک حرام اور باغی کہلائیں مجبوریوں میں ہمت ہار کر وطن کو خیر باد کہہ دینا اگر بزدلی کے مرادف نہ ہوتا تو ہم اس میں بھی عار نہ کرتے۔ مگر جدھر جائیں گے دنیا ہنسے گی کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر

دوسروں کے دروازے بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔ ریاست کی نوے فیصدی ملازمتیں اغیار کے قبضہ میں ہیں۔ شہر کی تجارت کو ریاست کے تجارتی ادارے نے خاک میں ملا رکھا ہے۔ زیادہ قیمت پر مال خرید کر کم قیمت پر فروخت کرنا اس کے اصول ہیں ظاہر ہے کہ ان حالات میں کوئی منافع کا حاجتمند کس طرح خرید و فروخت کر سکتا ہے۔ جہاں تک نقصان کا تعلق ہے ریاست کے خزانہ کی برکت سے کسی طرح اصل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ کاش اس چھوٹے سے ادارے ہی میں رعایا کا کچھ خیال کیا جاتا۔ معاشرت پر اتنی پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں کہ فاقہ سے پڑ رہنا بھی آسان نہیں۔ جب ہم کو ایک وقت پیٹ بھر کر روٹی ملنا دشوار ہے تو بچوں کی تعلیم اور تربیت کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ ہم اپنے سلطان کی توجہ اپنی بے چارگی پر مبذول کرا کے حقوق کے لئے انصاف کے ملتجی ہیں۔"

جمال نے مضمون پڑھ کر سنایا۔ اور مجمع نے باتفاق آرا منظور کیا۔ اس کے بعد آگے آگے جمال عرضداشت ہاتھ میں لئے ہوئے۔ ڈھائی تین ہزار کا مجمع پیچھے پیچھے۔ عزیز الدین اور رام پرکاش بیچ میں۔ کندھی سنگھ اور محمود خاں داہنے بائیں انتظام کرتے ہوئے قلعہ معلیٰ کی طرف بڑھے۔

باب ۱۳

"یہ کیسی خبریں سننے میں آ رہی ہیں عاصمہ"! وزیر اعظم نے غصہ میں سوال کیا۔
"ابا جان۔ میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب"۔ عاصمہ نے سادگی سے جواب دیا۔
"تم کاہے کو سمجھو گی"۔ وزیر اعظم نے تیوروں پر بل ڈال کر کہا۔ مگر عاصمہ نے پھر باپ کو بہلانے کی کوشش کی اور سہمی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔
"آپ تو پہیلیاں بجھا رہے ہیں۔ صاف صاف نہیں کہتے"۔
اس پر وزیر اعظم کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس نے برافروختہ ہو کر کہا۔
"سارے زمانے میں اس کا شہرہ ہے کہ جس دن جمال جیل سے رہا ہوا تھا تم نے اس کو کوئی ہار پیش کیا تھا"۔
"عاصمہ سر سے پیر تک لرز اٹھی۔ مگر اس نے دیدہ دلیری سے انکار کیا۔
"کیسا ہار؟ میں نہیں جانتی۔ ابا جان۔ یہ کس نے لگا دیا آپ سے"؟
"کہا جاتا ہے کہ نسیم بھی تمہارے ساتھ تھی۔ اس کو ایک بھی نہ کہہ دیا کسی نے۔ میں تمہارے انکار کو کیونکر تسلیم کر لوں"۔ وزیر اعظم نے کسی قدر

نرم ہو کر کہا۔ لیکن عاصمہ نے پھر بھی اقرار نہ کیا۔ وزیر اعظم کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"اچھا میں نسیم کو بلا کر تمھارے سامنے پوچھتا ہوں۔ حقیقت کھل جائیگی"

یہ کہکر اس نے خادمہ کو آواز دی اور نسیم کو اُسی وقت ہمراہ لانے کی تاکید کی۔ عاصمہ اس عرصہ میں گردن جھکائے سوچتی رہی۔ کئی بار اس نے وزیر اعظم کے چہرے کو دیکھا۔ پھر گردن جھکالی۔ بالآخر ایک مرتبہ اس نے باپ کو مخاطب کیا۔

"ابا جان آپ نسیم کو بلانے کی زحمت نہ کریں۔ میں خود سچ سچ بتائے دیتی ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ جہاں تک ہو سکے۔ یہ بات آپ سے چھپی رہے۔ اور آپ کو رنج نہ پہنچے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ چھپانا بے سود ہے۔ آپ خود اپنے زخموں کو کرید کرید کر تکلیف کا مواد فراہم کر رہے ہیں۔ میں جمال کو چاہتی ہوں۔ آج سے نہیں چار سال سے۔ جب وہ پہلے پہل ریاست میں ملازم ہوا تھا اگر اس نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا ہوتا تو یہ راز کب کا کھل چکتا۔ میرے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کی تکلیفوں کا دور ختم ہو اور وہ جیل سے رہائی پائے"

یہ کہہ کر عاصمہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور قدرے ٹھہر کر پھر کہنا شروع کیا۔

"میں نے اپنے ہاتھوں سے گوندھ کر اس کو اُن پھولوں کا ہار پیش کیا تھا۔ جو اس کے اور اپنے پسندیدہ تھے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں

کہ جمال کے لئے اگر مجھکو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں تو مجھے ذرہ برابر افسوس نہ ہوگا۔"

بیٹی کی تقریر سُن کر وزیر اعظم کو سناٹا سا آگیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جمال نے اُسی کی کمر کا خنجر نکال کر اُس کے سینے میں گھونپ دیا ہے۔ سکتے کے عالم میں دیوانوں کی طرح عاصمہ کو تکتا رہا۔ پھر کھوئے ہوے حواس مجتمع کر کے کہنے لگا۔

"بد کردار! یہی وجہ تھی کہ تو ہمیشہ عالم کو جھڑکتی رہی اور اس کی قربانیوں کو ملیا میٹ کرتی رہی۔ کیا تو اندھی ہو گئی ہے؟ تجھکو سوجھتا نہیں کہ جمال کا تجھ سے کوئی تناسب نہیں۔ تو اپنے ساتھ میری عزت بھی خاک میں ملانے پر تلی ہوئی ہے۔ ناعاقبت اندیش! تھوڑی دیر کے لئے جمال اور عالم کا مقابلہ ہی کر لیا ہوتا کون سی ایسی خوبی ہے کہ جمال کو عالم پر ترجیح دیتی ہے صورت شکل میں عالم بالکل انگریز۔ برخلاف اس کے جمال محض ہندوستانی جہاں تک دولت کا تعلق ہے زمانہ جانتا ہے کہ جمال کے پاس کیا ہے؟ عالم کا تعلقہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور پھر سماجی حیثیت میں جمال ایک سزا یافتہ مجرم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے اسباب ہیں کہ تو اس کے لئے اپنے کو برباد کر رہی ہے۔ جبکہ خود تجھے اقبال بھی ہے کہ وہ تیری طرف کوئی اعتنا نہیں کرتا۔"

وزیر اعظم ابھی جانے کیا کیا کہتا۔ مگر نسیم کمرہ میں داخل ہوئی۔ صورت حال دیکھ کر اس نے عاصمہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہمراہ لیے چلی گئی۔ وزیر اعظم

نے بھی اُن کے جانے کے بعد سواری مانگی اور قلعہ معلی کی طرف روانہ ہوگیا
کار قلعہ کے پھاٹک پر پہنچی تھی کہ ایک انبوہ کثیر جمال کے زیر قیادت
آتا نظر پڑا۔ اس سے قبل اس کو ان کارروائیوں کی اطلاع مل چکی تھی۔
وہ سیدھا نواب عالیجاہ کے حضور میں پہنچا۔ اور عرض پیرا ہوا
"جلالت پناہ! کل میں نے گذارش کی تھی، کہ جمال نے رہائی پاتے ہی
شہر میں ایک آگ سی لگادی ہے۔ رعایا کو ورغلا کر بغاوت پر آمادہ کیا
ہے۔ آج ہزاروں آدمیوں کا مجمع لے کر وہ کچھ عرض کرنے کے بہانے سے
قلعہ میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ تابعدار کو اندیشہ ہے کہ خزانہ شاہی پر حملہ
نہ ہو جائے"

"وہ لوگ تو نہتے ہیں۔ حملہ کیونکر کرسکتے ہیں"؟ نواب نے کہا۔
"نمکخوار کو اس کی اطلاع بھی ملی کہ کچھ بندوقیں خفیہ طور پر فراہم کرلی
گئی ہیں" چالاک وزیر نے فوراً جواب دیا۔ مگر نواب نے پھر تردید کی۔
"چند بندوقیں ہماری فوج کا مقابلہ کیا کرسکتی ہیں"؟
"مجھے رائے ہمایونی میں مداخلت کا حق نہیں ہے لیکن تدبّر اس کی
اجازت نہیں دیتا کہ ان لوگوں کو اندر آنے دیا جائے۔ اگر سرکار نے ہی صرف
چند آدمیوں کو باریابی کا موقعہ دیا تو بھی دل میں ہزاروں طرح کے شکوک
پیدا ہوتے ہیں"۔ وزیر اعظم نے زور ڈالتے ہوئے کہا۔
"پھر آپ ہی خوش اسلوبی سے یہ سورش ختم کرائیے" نواب نے وزیر کو
مصر دیکھ کر جواب دیا اور وزیر اعظم "بہت بہتر" کہہ کر اُٹھا۔ باہر آکر پھاٹک

پر فوج کی تعیناتی کا حکم دے دیا۔ جمال نے جب دیکھا کہ اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی تو اُس نے افسر محافظین قلعہ کو اپنی درخواست دیکر کہا

"سرکار کی خدمت میں عرض کر دینا کہ رعایا جواب کی منتظر ہے"

لیکن وزیر اعظم نے اس کو راستہ ہی سے یہ کہکر واپس کر دیا کہ

"سرکار نے فرمایا ہے کہ ہمارے پاس ایسی عرضیوں کا کوئی جواب نہیں"

جواب سُن کر مجمع میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ چشم زدن میں "وزیر اعظم مردہ باد" "انقلاب زندہ باد" کے نعرے قلعہ کی فصیل سے ٹکرا گئے اور رعایا راعی کی بارگاہ سے نفرت اور کدورت کا جذبہ لے کر واپس ہوئی۔

وزیر اعظم پھر نواب عالیجاہ کے پاس آ بیٹھا اور پبلک کا شور و غل سُن کر کہنے لگا۔

"دیکھا حضور نے۔ آنے کی اجازت نہیں ملتی تو یہ ہنگامہ ہے۔ اگر داخل ہو پاتے تو خدا جانے کیا قیامت ڈھاتے" مگر نواب نے اس کو یہ کہکر ٹال دیا کہ "اچھا جائیے اور روک تھام کا انتظام کیجئے"

باب ۱۴

نسیم کو جب عاصمہ سے وزیر اعظم کے غم و غصہ کا حال معلوم ہوا تو اس کے ساتھ ہمدردی کی ایک اُمنگ اُٹھی۔ مگر عشق کی بیقراری کے سامنے ہر ارادہ متزلزل اور ہر خیال پست ہو گیا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ تصور کی رو میں بہہ چلی۔ جمال کو صرف ایک بار چمٹا کر رنگینیوں میں جذب ہو جانے کی تمنا عاصمہ سے روگردانی کرنے پر اُکسانے لگی۔ اس نے گھبرا کر پکارا۔

"عاصمہ! میں......"

"کہو۔ کہو نسیم! رک کیوں گئیں"؟ عاصمہ نے پوچھا۔

اب نسیم کو ہوش آیا اور راز فاش ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ اُس نے سنبھل کر جواب دیا۔

"میں کہہ رہی تھی کہ دنیا تمھارے خلاف ہے۔ بلا سے۔ تم اس کی پروا نہ کرو۔ نسیم مرتے دم تک تمھارے ساتھ رہے گی"

"تمھاری ہمدردی اور دلدہی کا شکریہ۔ مگر میری محبت ایسی نہیں جس کو کبھی پروان چڑھنا ہو۔ بدنصیبی اول دن سے مہربان ہے۔ اور شاید قبر کے گوشہ تک ساتھ نہ چھوڑے"۔ عاصمہ نے دردآمیز لہجہ میں کہا۔

"نسیم میری نامرادی کے وجوہ ہیں۔ ابا جان الگ ناراض ہیں۔ عالم کو جب معلوم ہوگا تو وہ جمال کو ایذا پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے گا۔ جمال یوں ہی صورت دیکھکر بھاگتا ہے اور جب صرف میری ذات سے اتنی مصیبتیں نازل ہوں گی تو اور بھی بیزلد ہو گا۔"

"تم ابھی عشق کی مصیبتوں سے واقف نہیں۔ عاصمہ! قصے کہانیوں سے قطع نظر کر کے دیکھو تو روزانہ کے مشاہدات میں ایسی مثالیں مل جائینگی کہ اس سے ہزار گنی دشواریاں سامنے آئیں مگر کامیابی کا سہرا جذب صادق رکھنے والوں کے سر رہا۔" نسیم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں خدا کیا دکھاتا ہے۔" یہ کہکر عاصمہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئی نسیم بھی تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی۔ پھر مشورہ کے طور پر پوچھنے لگی۔

"کہو تو میں عالم سے خود اس پیرایہ میں بیان کر دوں کہ وہ زیادہ مشتعل نہ ہو۔ آخر کسی نہ کسی دن اس کو ان واقعات کا علم ہونا ہی ہے۔ اچھا یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود ہی کہہ دیا جائے۔"

عاصمہ ابھی جواب دینے نہ پائی تھی کہ عالم آتا ہوا دکھائی دیا۔ نسیم اس کو دیکھکر کہنے لگی

"خدا خیر کرے۔ عالم کا چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ قرینہ کہتا ہے کہ اس کو ہر بات کا علم ہو چکا ہے۔"

"ہو جانے دو مجھکو کوئی پرواہ نہیں۔" عاصمہ نے جواب دیا۔ اتنے میں

عالم بھی آگیا اور یہ دونوں خاموش ہوگئیں۔ عالم نسیم کے قریب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور چند منٹ خاموش رہنے کے بعد خود بخود کہنے لگا۔
"نسیم! میں کل صبح کو جا رہا ہوں۔ تم بھی چلوگی یا ابھی رہنے کا ارادہ ہے"
"بھائی جان! آپ اک دم آنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اور جانے کے لئے بھی۔ انسان پہلے سے کوئی پروگرام بناتا ہے۔ تب اس پر عمل ہوتا ہے۔ کل تک تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں مستقل طور سے رہوں گا اور آج جانے کے لئے آمادہ ہیں"
"نسیم کے جواب پر عالم کچھ جھلا کر کہنے لگا۔
"یہاں میری انتہائی توہین کی گئی۔ اس سرزمین پر جہاں خلوص کو ٹھکرایا جائے۔ محبت کی ناقدری کی جائے میں ایک سکنڈ کے لئے ٹھہرنا پسند نہیں کرتا"
"میں تسلیم کرتی ہوں کہ آپ کی ہتک ہوئی۔ لیکن کس نے کہا تھا کہ عشق کا سودا خریدئیے۔ اس کا قصور وار کون ہے؟ عاصمہ نے کبھی اقرار محبت کیا ہوتا اور آج انکار کر جاتی تو میں کیا ساری دنیا اس کو نفرین کرتی" نسیم نے اس کو دھیما کرنے کی کوشش کی۔ لیکن عالم اس جواب پر اور بھی بھڑک اٹھا اور یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
"تم اور الٹے مجھ ہی کو مجرم بناتی ہو"
اس کو اس طرح جاتے دیکھ کر نسیم نے عاصمہ کو اور عاصمہ نے نسیم کو مسکرا کر دیکھا اور گردن جھکالی۔

عالم وہاں سے اُٹھکر وزیر اعظم کے کمرے میں آیا۔ محمد شریف خاں کوتوال بھی موجود تھا وہ بھی ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اور اُن کے باہمی مکالمہ کو توجہ سے سننے لگا۔ کوتوال نے وزیر اعظم کو جمال کی ساری کارروائی کا حال بتایا۔ دوسرے دن ہونے والے جلسہ کی خبر دی۔ اور ضروری ہدایات حاصل کر کے رخصت کی اجازت چاہی۔ مگر عالم نے اس کو بٹھالیا اور کہنے لگا۔

"کوتوال صاحب۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ درخت بار آور ہونے سے قبل اس کی جڑیں کیوں نہیں کاٹ دیتے کہ ہمیشہ کا خطرہ ہی مٹ جائے"

لیکن کوتوال اس اشارہ کو نہ سمجھ سکا۔ اور عالم کو اس کی وضاحت کرنا پڑی۔ اس نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ یہ ساری آگ جمال کی لگائی ہوئی ہے۔ اس کو راستہ سے ہٹا دیا جائے تو قصہ ہی ختم ہو جائے"

"مگر راستہ سے ہٹایا کیسے جائے"؟ کوتوال نے دریافت کیا۔ اس پر عالم نے طنز سے کہا

"آپ شہر کے کوتوال ہیں۔ جس کو چاہیں جیل بھیجدیں یا ٹھکانے لگادیں

جہاندیدہ کوتوال نے اس کو سمجھایا کہ ان میں کا کوئی فعل اس کے امکان میں نہیں ہے۔ جمال کوئی اخلاقی مجرم نہیں۔ اور اخلاقی مجرم بھی ہوتا تو عدالت ثبوت کی طالب ہوتی۔ اس پر وزیر اعظم نے اُسے یقین دلایا کہ ایسے چالان بلا ثبوت بھی کامیاب ہوسکتے ہیں مجبور ہو کر اس نے جمال

کے دوسرے ساتھیوں کے لئے اس قسم کی کارروائی کا اقرار کیا اور عالم کے اصرار کے باوجود جمال کے لئے کوئی وعدہ نہ کرسکا۔ اس نے کہا۔

"عالم میاں! آپ کہتے ہیں کہ جمال کی شخصیت ہی کیا ہے؟ لیکن اس کا اندازہ تو صرف وہی کرسکتا ہے۔ جس نے انسانوں کے سمندر میں اس کی تقریر سنی ہے۔ میں تو اس حد تک قائل ہوں کہ اس کا ایک ادنیٰ اشارہ خون کی ندیاں بہانے کو کافی ہے"

عالم نے لاجواب ہو کر اور مصلحت وقت سمجھ کر خاموشی اختیار کرلی اور وزیر اعظم نے بھی کوئی تردید نہ کی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر کوتوال تو چلا گیا عالم نے موقع پاکر وزیر اعظم سے اپنے جانے کا عزم ظاہر کیا بڈھے وزیر نے اس کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"عاصمہ ابھی الھڑ ہے۔ تم کو ان باتوں کا خیال بھی نہ کرنا چاہیئے۔ اور ہر طرح اطمینان رکھنا چاہیئے۔ میں بہر حال اپنے وعدہ پر قائم ہوں"

طفل تسلی سے مطمئن ہو کر عالم بھی وہاں سے اُٹھا۔ اور نسیم کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ تنہا لیٹی ہوئی اخبار دیکھ رہی تھی۔ بھائی کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھی اور کہنے لگی۔

"آپ اس وقت ناحق ناراض ہوگئے۔ میرا منشار تو یہ تھا کہ آپ کا غصہ فرو ہو جائے"

مگر عالم نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اور اپنی شخصیت جتا کر کہنے لگا۔

"میں نے وزیر اعظم سے سب معاملہ طے کر لیا ہے۔ اُنھوں نے پکا وعدہ کیا ہے، دیکھنا ہے جمال عاصمہ کی کیا مدد کرتا ہے۔"

"عاصمہ کو جمال کی کسی قوت پر گھمنڈ ہوتا تو آپ کہتے بھی" نسیم نے سادگی سے جواب دیا۔

"اگر وہ کچھ کر بھی سکتا۔ تو میں نے وہ انتظام کیا ہے کہ وہ کسی قابل نہ رہ جائے" عالم نے کہا۔

"وہ کس طرح؟" نسیم نے بھائی کی بات پر ہمہ تن گوش بن کر پوچھا اور عالم نے من وعن اپنی اور کوتوال کی ساری گفتگو دہرا دی۔ اور آخر میں ڈینگ مارتے ہوئے کہنے لگا۔

"ابھی صرف جمال کے ساتھیوں کی گرفتاری کی تدبیر ہے۔ خود جمال کا گرفتار کرنا مناسب نہیں۔ آگے چل کر اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

نسیم نے کل واقعہ سُن کر بھائی کی ذہانت کی تعریف کی اور وہ داد طلب نظروں سے دیکھتا ہوا رخصت ہو گیا۔

باب ۱۵

"صبح کی ڈاک سے جمال کو ایک گمنام خط موصول ہوا لفافہ پر اُسی تاریخ میں "گلزار ارمین" کی مہر تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ بھیجنے والا کوئی مقامی شخص ہے۔ اور عجلت میں تاریخ یا دن لکھنا بھول گیا ہے۔ جمال خط ہاتھ میں لئے دیر تک غور و فکر کرتا رہا۔ پھر ایک والنٹیر کے ذریعہ عزیزالدین کو بلا بھیجا۔ وہ اطلاع پاتے ہی آگیا اور جمال کے ہاتھ میں سبز رنگ کا لفافہ دیکھ کر کہنے لگا۔

"شاید کوئی نئی بلا نازل ہوئی ہے۔"

جمال نے کسی جواب کے بجائے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لفافہ سے ایک ہمرنگ پرچہ نکال کر پڑھنا شروع کیا

"ہر دلعزیز جمال!"

"سامنے آنا میری مصلحتوں کے خلاف ہے لیکن میں ہمہ وقت آپ کے ساتھ ہوں۔ کوتوال شہر آپ کے جیل کے ساتھیوں کو پھر ماخوذ کر کے جیل بھیجنے کی فکر میں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایسے لوگوں کو کچھ دنوں کے لئے ہٹا دیجئے یا جو کچھ بھی کرنا ہے اس میں عجلت کی ضرورت ہے۔"

پس پردہ آپ کا ایک بہی خواہ

عزیزالدین نے خط پڑھ کر جمال کو واپس کر دیا۔ اور کہنے لگا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وزیر اعظم نے کوئی نئی چال چلی ہو۔ اور آج کے جلسہ کی تخریب کے لئے یہ کارروائی عمل میں لائی گئی ہو۔"

"امکان اس کا بھی ہے لیکن انداز تحریر سے خلوص کی بو آتی ہے۔"

جمال نے جواب دیا۔

"مجھے تو اس میں نسوانیت کی جھلک معلوم ہوتی ہے" عزیزالدین نے عاصمہ پر شک کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"اس کا سواد خط میں نے دیکھا ہے وہ اس سے بالکل الگ ہوتا ہے"

جمال نے اس کا مافی الضمیر سمجھتے ہوئے کہا۔

"پھر کس نے لکھا ہے؟ ظاہر ہے کہ لکھنے والا ایسی شخصیت کا مالک ہے۔ جس کو اس قسم کے راز وقت سے پہلے معلوم ہو گئے عاصمہ نے لکھا نہیں۔ وزیر اعظم کی کوٹھی میں کوئی دوسری عورت بھی نہیں۔ شاید نیچے درجہ کے لوگوں میں سے کسی کو معلوم ہو گیا ہو۔" عزیزالدین نے تبصرہ کیا۔

جمال تھوڑی دیر تک سکوت کے عالم میں غور کرتا رہا۔ پھر یکایک کچھ سوچ کر اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اور مسرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے عزیزالدین کا سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لکھا جس نے بھی ہو۔ میرے نزدیک یہ تحریر صداقت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس خط کے ملنے سے قبل ہی میں اس کارروائی کی امید کر رہا تھا۔ اور میرے خیال میں اس کے بعد تمہارا اور رام پرکاش وغیرہ کا اور آخر میں

میسر المنبر ہے۔"

"شریف خاں سے ایسی اُمید نہیں ہوسکتی" عزیز الدین نے کہا۔ اور جمال نے سلسلہ کلام میں جواب دیا۔

"وہ ماتحت ہیں۔ جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کریں گے۔ اتنے مطیع نہ ہوتے تو آج اس عہدے پر دکھائی نہ دیتے ہم لوگوں کو خود چاہیئے کہ دو چار آدمی جو ملازمین میں ہمارے ہمدرد ہیں۔ ان کا پوزیشن صاف رکھنے کی کوشش کریں" ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"میرے خیال میں تو کندھئی سنگھ اور محمود خاں کو اپنے ساتھیوں سمیت کچھ دنوں کے لئے شہر چھوڑ دینا چاہیئے آخر ہماری اسکیم بھی تو یہی ہے کہ رضاکاروں کو فنون حرب کی ٹریننگ دی جائے۔ صرف ستیہ گرہ کرکے یا عدم تشدد کی پالیسی پر عمل پیرا ہوکر کامیابی یقینی نہیں ہے۔ ضرورت پڑنے پر جب عورتوں کی عزت کا سوال ہو یا خود حالات کا تقاضہ ہو۔ اور سر بکف ہوکر مقابلہ کی نوبت آہی جائے۔ تو انسان نما درندوں کے سامنے مظلوم بن کر آنا اور خونخوار خنجروں کو لہو چٹا کر فنا ہو جانا کوئی مردمی کا شعار نہیں۔ ہم کو مرنا ہے تو مار کر مرنا چاہیئے۔"

ہمارے پاس اسلحہ کہاں ہیں؟ کہ ہم باقاعدہ فوج کی سی تنظیم کرسکیں" عزیز الدین نے استفسار کیا۔

"انھیں مجبوریوں کی بنا پر تو میں خاموش تھا۔ مگر اب ہم کو اپنی تعداد میں کمی کرنا ہی ہے تو اس سے کچھ فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ روپوشی کے

زمانے میں جو تیاری بھی ہو سکے۔ کی جائے۔ بندوقیں دس پانچ فراہم ہو ہی جائیں گی بقیہ لوگ لاٹھی اور بلم سے مسلح ہو سکتے ہیں۔ انتظام ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ یہ لوگ زیادہ دور بھی نہ جائیں تاکہ ضرورت پڑنے پر ہر وقت بلائے جا سکیں۔"

عزیز الدین نے جمال سے پوری اسکیم سُن کر تبادلۂ خیالات کے بعد یہ یہ کام اپنی ذمہ داری پر لے لیا اور جمال جلسہ گاہ کی ترتیب کے لیئے چند رضا کاروں کو لے کر روانہ ہو گیا۔

چار بجے سے پہلے پہلے لمبا چوڑا میدان۔ بوڑھوں۔ بچوں اور جوانوں سے بھر گیا۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دینے لگے۔ مجمع کا اندازہ کسی طرح دس بارہ ہزار سے کم نہ تھا۔ جا بجا سرخ پگڑیوں کے الارم میں جمال نے اپنی تقریر شروع کی۔ اور آہستہ آہستہ اس میں اتنا جوش پیدا ہو گیا کہ وہ دیوانہ وار ہاتھ پھینک کر کہنے لگا۔

"وطنی بھائیو! وقت آگیا ہے کہ ہم کو اپنی مقدس زمین کو بدیسی کتوں سے پاک کرنے کے لئے اپنے سروں کی بازی لگانا پڑے گی۔ ظلم و استبداد کی تلوار جس نے ہمارا خون چوس چوس کر اپنی پیاس بجھائی ہے۔ پھر بجلی کی طرح کوندرہی ہے۔ اُٹھو اور مادر وطن کے نام پر اس کی چمکتی ہوئی دھار کو اپنی شہ رگوں سے موڑ دو"

اس کے ان جملوں نے سامعین کو آپے سے باہر کر دیا۔ مجمع پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ انقلاب کے نعرے آسمان ہلانے لگے۔ جمال نے

موقع کی نزاکت محسوس کر کے تقریر کا رخ بدل دیا اور اگلے جلسہ میں اپنا پروگرام پیش کرنے کا اعلان کیا۔ اسی اثناء میں شریف خاں کوتوال سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر اسٹیج کے قریب پہنچا۔ اور جمال سے پوچھنے لگا۔

"کہاں ہیں کندھئی سنگھ اور محمود خاں"؟

"مجھے نہیں معلوم"۔ جمال نے جواب دیا مگر شریف خاں نے پھر کہا "میں کوتوال شہر کی پوزیشن میں پوچھ رہا ہوں آپ سے۔

"ایسے سوالات کا جواب دینے کے لئے میں اپنے کو پابند نہیں سمجھتا" جمال نے باوقار لہجہ میں جواب دیا۔

سلطان بیگ افسر دویم کو اس جواب پر کچھ طیش آگیا۔ اس نے سخت الفاظ میں بازپرس کی۔ لیکن جمال کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ مجمع سے صدہا آوازیں بلند ہوئیں۔

"بدتمیز کو اس کی سزا دو"

قریب تھا کہ پبلک پولیس پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن جمال نے اسٹیج سے چلانا شروع کیا۔ "بھائیو۔ بنا بنایا کھیل نہ بگاڑو۔ حالات کی اہمیت کا احساس کرو"۔ اِدھر اس کی آواز پر مجمع رُکا۔ اُدھر شریف خاں نے پولیس کو موقع سے مارچ کرادیا۔

باب ۱۶

"سانولو" نسیم کی نوجوان خادمہ۔ اس کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو اپنی مالکہ کی خیریت لینے کے لئے تنہا سعد آباد سے چل پڑی۔ اس کا سن تو ابھی زیادہ نہ تھا نسیم ہی کی ہم عمر تھی۔ مگر ذہانت اور استقلال میں اپنی آپ مثال تھی۔ اس کی شادی علمہ کے ایک منشی سے قرار پائی تھی۔ مگر اس کا دل نہ چاہتا تھا کہ مالکہ سے اس طرح جدا ہو جائے۔ اس نے طے کیا تھا کہ جب تک نسیم کی شادی نہ ہو جائے گی وہ بھی یونہی بیٹھی رہے گی۔ حالانکہ کبھی کبھی جذبات کے زیر اثر یہ خیال ڈانواڈول ہو جاتا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ پھر اپنے ارادہ پر قائم ہو جاتی۔ نسیم جب "گلزارمین" کو روانہ ہوئی تھی تو اس نے سانولو سے دو چار دن میں پلٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر مہینے گذر گئے نہ کوئی خط آیا اور نہ خود واپس ہوئی "سانولو" کو تشویش تھی۔ آخر ایک روز وہ اپنی بوڑھی ماں سے اجازت لے کر روانہ ہو گئی۔ اور گلزارمین کے اسٹیشن پر ٹرین سے اُتر پڑی۔

صبح چار بجے کا وقت تھا۔ پو پھٹنے لگی تھی۔ نیند کی ماتی گاڑی سے اُتر کر اسٹیشن سے باہر آئی مگر چاروں طرف نظر دوڑانے کے باوجود کسی قسم

کی کوئی سواری یکہ یا تانگا دکھائی نہ دیا۔ پلٹ کر اس نے اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کیا

"کیا یہاں اسٹیشن پر یکے تانگے نہیں ملتے"؟

"میڈم۔ گلزار مین کا اصل اسٹیشن آگے ہے۔ آپ غلطی سے یہاں اُتر پڑی ہیں"۔ اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا

" سانو لو کو یہ سُن کر سناٹا سا آگیا۔ ٹرین جا چکی تھی۔ دوسری ٹرین کا انتظار کرتی تو دوپہر تک ٹھہرنا پڑتا آخر اس نے چار میل کی مسافت پا پیادہ طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور خدا کا نام لے کر قدم بڑھانے لگی

سہانا وقت تھا۔ طائر زمزمے بھر رہے تھے۔ افق مشرق پر ہلکی ہلکی سرخی نمودار ہو رہی تھی۔ نسیم کی مست خرام خادمہ اپنی غزالی آنکھوں میں مناظر فطرت کی کیفیتیں سموتی ہوئی۔ چلنے لگی۔ بن جانی بوجھی منزل۔ کچھ دور بڑھ کر راہ سے بے راہ ہو رہی۔ سورج نکل آیا۔ مگر آبادی کا کوئی نشان نہ ملا۔ سانو لو کو گھبراہٹ ہوئی۔ کم وبیش چار میل کا فاصلہ وہ طے کر چکی تھی۔ مگر مستقر کے آثار کا پتہ نہ تھا۔ اس نے سر راہ جاتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا

"بھائی وزیر اعظم کا بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے"؟

آدمی نے سر سے پیر تک سانو لو کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"آپ جس راستے پر جا رہی ہیں۔ اُسی پر پلٹ جائیے۔ تین میل پر آپ کو داہنی طرف جاتا ہوا دوسرا راستہ مل جائے گا لیکن اس طرح آپ کو پانچ چھ میل چلنا پڑے گا۔ سامنے جو جنگل کا ٹکڑا ہے۔ اس میں ہو کر ایک پگڈنڈی

گئی ہے ادھر سے کوٹھی کا فاصلہ ساڑھے تین میل چار میل سے زیادہ نہیں ہے
مگر ادھر ہو کر جنگلی جانوروں کا خطرہ ہے۔"
"سانولو" نے فطرت سے ایک بہادر دل پایا تھا۔ پھر بھی جنگل کے نام
سے اس کے قدم پیچھے ہٹنے لگے۔ تھوڑی دیر تک وہ کشش و پنج میں کھڑی
رہی۔ پھر اس نے طے کیا "جنگلی راستہ بہت تو ہے نہیں۔ جلد جلد گذر
جاؤں گی"۔ چھ میل کی لمبی مسافت پر کم فاصلہ کو اس نے ترجیح دی۔ اور
ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی تیز رفتاری سے بڑھنے لگی۔ ابھی مشکل سے چار
پانچ فرلانگ طے کئے ہوں گے کہ دو آدمی ایک جھاڑی سے نکلے اور
اس کو دبوچ لیا۔ انھوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور پیٹھ پر
لاد کر ایک طرف کو چل دیئے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن کپڑا منھ
میں ٹھنسا ہونے کے باعث کامیاب نہ ہو سکی۔ تھوڑی دیر بعد اس کو کچھ
آدمیوں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اور وہ ایک جگہ لا کر کھڑی کر دی گئی۔
پٹی آنکھوں سے کھُلنے پر اس نے اپنے کو دو سادی الحیثیت آدمیوں کے
سامنے موجود پایا جو آدمی اس کو لائے تھے وہ بھی ایک طرف کھڑے ہوئے
دکھائی دیئے۔ بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے اس کا نام و پتہ دریافت کیا
اس نے ڈرتے ڈرتے ساری کیفیت کہہ سنائی۔ حال معلوم کر کے اُس آدمی
نے برابر کے آدمی سے چپکے چپکے کچھ مشورہ کیا اور سانولو سے کہنے لگا۔
"آپ کو بیکار کی تکلیف ہوئی لیکن اب اس وقت تک ٹھہرنا پڑے گا۔ جب
تک ہم اپنے افسر سے کوئی حکم حاصل نہ کر لیں"۔ اس کے بعد وہ ایک علیحدہ

خیمہ میں پہنچادی گئی۔ جہاں ضروریات کا سامان پہلے سے فراہم تھا۔ باہر نکل کر عقب خیمہ سے ایک آواز اُسے یہ کہتے سنائی دی۔

"تم لوگ بلا وجہ ایک شریف عورت کو پکڑ لائے۔ ایسی ناشائستہ حرکتیں انتہائی بدنام کن ہیں۔ اُن سے افشار راز کا اندیشہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس زندگی کو اپنے پیشہ کی زندگی سمجھ رکھا ہے۔ ایسے ہی افعال کرنا ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔"

جواب میں دبی زبان سے وہ صرف اتنا سُن سکی۔

"ہمیں کیا معلوم تھا۔ ہم تو اس کو جاسوس سمجھ کر لے آئے تھے۔"

سانو لو نے سارا دن کرب و بے چینی میں کاٹا۔ گو آسائش کی ہر شے مہیا تھی۔ مگر اضطراب میں بھوک پیاس اُڑ گئی تھی۔ اس سے کچھ کھایا پیا نہ گیا سہ پہر کو ایک آدمی نے آکر دریافت کیا۔ کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور نفی میں جواب لے کر چلا گیا وہ دن بھر اپنی بے چارگی کے احساس میں پریشان رہی۔ دماغ میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوئے۔

"یہ لوگ کون ہیں؟ ڈاکو تو ہیں نہیں۔ ورنہ ایسا شریفانہ برتاؤ نہ کرتے اگر ڈاکو نہیں ہیں تو اس طرح جنگل میں زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔"

اسی اُلجھن میں شام ہو گئی۔ سورج تریرے بھرنے لگا۔ چڑیوں کے چہچے سنائی دینے لگے۔ اس کا دل تڑپ اُٹھا۔ وہ خیمہ سے باہر نکلی۔ اور فوجی بگل کی آواز سُن کر ٹھہر گئی۔ اس نے دیکھا وہی آدمی جو جنگل میں منتشر تھے سمٹ کر آگئے۔ سب کے سب فوجی لباس میں موجود ہیں۔ دیکھنے والا شبہ

بھی نہیں کر سکتا کہ یہ فوج کے سپاہی نہیں۔ صرف ان کے داہنے شانوں پر سبز رنگ کی چٹیں بندھی ہوئی ہیں۔ جو شاہی فوج سے علیحدہ کسی جماعت پر دلالت کرتی ہیں۔ تمام آدمی تین دستوں پر منقسم ہو گئے۔ ایک چھوٹے سے دستے کے ہاتھ میں دیسی ساخت کی بندوقیں۔ دوسرے کے ہاتھ میں بلم اور تیسرے کے ہاتھ میں لاٹھیاں ہیں۔ پریڈ کے بعد ہر دستہ نے حربی مشق شروع کی۔ بلم اور لاٹھی کے مظاہرہ میں سانولو کا جی بہل گیا اور وہ اُن کی فنی مہارت کا اثر لے کر کھڑی رہ گئی۔

باب ۱۷
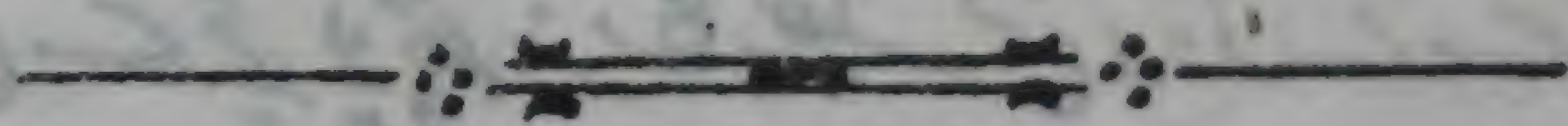
جمال کو اپنی گوناگون مصروفیت سے جب کبھی فرصت ہوئی۔ اور سکون سے کچھ سوچنے کا موقع ملا۔ اس کو عاصمہ کی حورنزاد سہیلی نسیم اختر کا خیال آیا۔ وہ گھنٹوں اس کے تصور میں محو رہا۔ لیکن سیاسی اُلجھنیں کچھ اس طرح گھیرے ہوئے تھیں۔ کہ ہزار بار استفسار کی نیت کرنے کے باوجود وہ اس کی بابتہ کسی سے کچھ پوچھ نہ سکا۔ جلسہ کئی روز کے لئے ملتوی ہو چکا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سگریٹ نوشی میں مشغول تھا۔ عزیزالدین اور رام پرکاش کے نہ آنے کے باعث پروگرام نظرثانی کا محتاج تھا۔ انتظار میں اس کی نگاہیں آہٹ پاکر دروازے کی طرف اُٹھیں۔ اور ایک آدمی نے کندھی سنگھ کا خط اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مرقوم تھا کہ

"سعد آباد کی تعلقدار یہ نسیم اختر کی خادمہ سانو لو کو غلطی سے پکڑ لیا گیا ہے۔ اگر بلا کسی احتیاط کے چھوڑ دیا گیا تو راز فاش ہو جانے کا احتمال ہے ایسی حالت میں مناسب لائحہ عمل کے لئے ہدایت خواہ ہوں۔ یہ نسیم اختر آج کل، وزیر اعظم کے یہاں مقیم ہیں اور غالباً وہی خاتون ہیں جن کو ہم سب نے جیل میں دیکھا تھا۔"

جمال نے کندھی سنگھ کو تو لکھ دیا کہ

"سانولو کو کسی سواری میں میرے یہاں بھیج دو اور تم لوگ اپنا کیمپ مغرب کی پہاڑیوں پر منتقل کر دو۔"

لیکن نسیم اختر کے نام نے اس کے دل میں ایک خلش سی پیدا کر دی۔ حافظہ نے یقین دلایا۔

"میری محبوبہ وہی نوخیز حسینہ ہے جس کو میں نے دریا کے کنارے طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا۔" مگر توقعات بڑھنے کے بجائے اس کے دل میں مایوسی سی طاری ہو گئی وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

"شاید وہ گمنام اُسی کا خط نوشتہ تھا۔ عاصمہ کی تحریر نہ تھی۔ وزیراعظم کی کوٹھی کے علاوہ اور کہاں سے انکشاف راز کا امکان تھا۔ خود شریف خاں نے یہ کارروائی کرائی ہو اس کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ اور کون ہے جو ایسے اہم راز سے واقف ہو سکے۔ عاصمہ کے ساتھ وہ رہائی کے وقت بھی آئی تھی۔ ہمدردی نہیں تھی تو آنے کی اور وجہ کیا تھی؟ مگر اس نے نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ایک رئیس اور تعلیم یافتہ خاتون اپنے وقار کو کیوں کھوتی؟ عاصمہ کو اس دن کیا ہو گیا تھا۔ تمام دنیا میں اپنے کو رسوا کر دیا۔ شاید وہ محبت سے مجبور ہو گئی۔ کمبخت جمال! دیکھیں تیرا کیا حشر ہو۔ جو تیری خاطر اتنی قربانیاں کرے تجھکو اس کا خیال تک نہ آئے اور جو تجھکو پورے طور پر جانتا بھی نہیں۔ اس کے لئے تو دیوانہ ہو رہا ہے۔ دل خانہ خراب جانے کیا کرنے والا ہے۔ لاکھ بہلانے کی سعی کے باوجود خیال ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ عاصمہ

خوبصورت عاصمہ، میں تیرا تصور کروں گا۔ میں تیری پرستش کروں گا۔ مگر تیری تصویر تو دھندلی ہوئی جاتی ہے۔ پھر اُسی سراپا ناز قتالہ کا نقشہ نگاہوں میں پھر رہا ہے۔"

جمال گھبرا کر اُٹھا۔ مگر پھر اُسی جگہ بیٹھ گیا۔ اور قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کیا۔
میں آپ سے صورت آشنا ہوں اور اب نام سے بھی واقف ہوں۔ آپ کا نقشہ میری نظر میں ہے اور رفتار کی دھمک دل میں ہے۔ ایک مرتبہ جیل میں۔ دوبارہ رہائی کے ہنگام سرراہ دیکھ چکا ہوں پھر بھی اجنبی ہوں ایک خاص ضرورت کی بنا پر تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ خود قیام گاہ پر حاضر ہوتا۔ مگر ایک سزا یافتہ مجرم اور حکومت کے باغی کی ملاقات آپ کی سی باعزت وعفت خاتون کے شایان شان نہیں۔ چند باتیں کرنے کا متمنی ہوں۔ لیکن ایسی جگہ جہاں دنیا دیکھ نہ سکے اور آپ کی توہین کا امکان نہ ہو۔ اس لئے انقلابیوں کے دفتر میں آپ کا انتظار کروں گا اور آپ کی خادمہ سانو بھی آپ کی منتظر رہے گی۔

چشم براہ
جمال

خط لکھ کر جمال نے ایک رضا کار کو دیا اور ہدایت کردی کہ وزیر اعظم کے یہاں جو دُبلی پتلی خاتون مہمان ہیں انھیں کے ہاتھ میں دینا۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ ٹھنڈے دل سے انجام پر غور کرنے لگا۔ عزیز الدین اور رام پرکاش آکر بیٹھ گئے۔ مگر اس کو ہوش نہ آیا۔ تھوڑی دیر انتظار کرکے

رام پرکاش نے مخاطب کیا

"کس سوچ میں ہیں آپ"؟

جمال نے آواز سن کر سر اٹھا اور مسکرا کر معذرت کی۔ تینوں دوستوں نے ایجیٹیشن کے ہر پہلو پر مباحثہ کیا طے یہ ہوا کہ اگلے جمعہ کو قلعہ معلی کے دروازے پر بھوک ہرتال کی جائے۔ پروگرام بن جانے کے بعد عزیزالدین اور رام پرکاش تو چلے گئے۔ جمال مکان کے اندرونی حصہ میں آیا۔ جہاں "ساونو" گھنٹوں پہلے عقبی دروازے سے پہنچ چکی تھی۔ اور رات ہو جانے کے باعث گھبرا رہی تھی۔ اس نے ہر ممکن طریقہ سے اس کو تسلی دی۔ اور خود باہر آکر صحن میں ٹہلنے لگا۔

ایک برقعہ پوش خاتون تانگے سے اتری اور اس کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ جمال نے چبوترے پر بچھی ہوئی کرسیوں کی طرف ہاتھ اٹھایا اور خود بھی آہستہ آہستہ چل کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نووارد خاتون بھی برقعہ اتار کر قدرے جھجک کے ساتھ سامنے آکر بیٹھ گئی۔ جمال نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ایک بجلی سی کوند کر آنکھوں میں قائم ہو گئی۔ کلیجہ تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں گویا ہوا

"اس زحمت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں اور قدر افزائی کا متشکر ہوں"۔

"اس میں زحمت کاہے کی؟ اور شکریہ کا کون سا محل ہے؟ آپ نے طلب فرمایا، میں حاضر ہو گئی"۔

"نسیم نے شرمائی ہوئی ادا سے جواب دیا۔
"میں بہت پہلے سے آپ کا ممنون کرم ہوں۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو یہ تحریر انھیں حنائی ہاتھوں کی ہے۔"
یہ کہکر اس نے وہ خط کندھئی سنگھ وغیرہ کی گرفتاری کی بابت تھا۔ ہاتھ بڑھا کر پیش کیا۔ مگر نسیم خط کی طرف اعتنا کئے بغیر کہنے لگی۔
"میں آپ کی ذکاوت کی داد دیتی ہوں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابل ذکر ہو۔ ہاں یہ فرمائیے سانولو کہاں ہے؟ اور آپ تک کیسے پہونچی؟"
"جمال نے خط جیب میں رکھ لیا اور مختصر سی تمہید کے بعد سارا قصہ بیان کر دیا۔ اتنا اہم راز عام حالات میں وہ کسی پر ظاہر نہ کرتا۔ مگر جس دن سے وہ عاصمہ کے ساتھ اس کی رہائی کے وقت گئی تھی اس نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ وہ اس کے ساتھ غدّاری نہیں کر سکتی۔ اور خط کا راز افشا ہو جانے کے بعد تو وہ اپنی قلبی گرویدگی سے الگ ہو کر بھی اس کا مفتون ہو چکا تھا۔ پھر بھی بمقتضائے احتیاط اس نے پردہ داری کی استدعا کی۔
"احسان کا بدلہ بدی نہیں ہوتا۔ سانولو کے ساتھ آپ کا حسن سلوک میرے دل پر نقش رہے گا۔" نسیم نے کہا
"یہ تو سب آپ کی تشریف آوری کی بابت تھا۔ اب کیا میں مکمل تعارف کی درخواست کر سکتا ہوں"؟ جمال نے مجسمہ سوال بن کر استفسار کیا۔

"میں تو سمجھ رہی ہوں کہ آپ میرے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ ہاں، میں ہی ایسی کم نصیب ہوں کہ اپنے کرم فرما سے ہمکلام ہو کر بھی پوری وقفیت نہیں رکھتی"۔ نسیم نے جواب دیا۔

"اتنی بدنامیوں کے باوجود آپ حالات سے انجان ہیں" جمال نے خوشگوار طنز کیا۔

"آپ نے خط میں بھی اسی قسم کے جملے تحریر کئے تھے۔ اور اس وقت بھی اپنے کو اس طرح کہہ کر مجھ کو شرمندہ کرتے ہیں"۔ یہ کہکر نسیم نے جمال کو دیکھا اور اس نے صفائی پیش کی۔

"میں تو اپنے کو انھیں الفاظ سے یاد کرتا ہوں جو آپ نے مجھکو دیکھکر استعمال کئے ہوں گے"۔

"میں۔ نے۔ آ۔ پ۔ کے۔ لئے"۔ نسیم نے رُک رُک کر مطلب ادا کیا۔

"کیا ایک قیدی کے لباس میں پہلی بار جب آپ نے مجھکو دیکھا تھا تو میری بدکرداری کا یقین نہیں کیا تھا"۔

جمال کے ان جملوں پر نسیم جذبات سے مغلوب ہو کر اُٹھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آبدیدہ نگاہوں سے مس کئے اور گلوگیر آواز میں کہنے لگی

"میرے محسن! میں کم ظرف ہوں۔ احسان فراموش ہوں میں نے پہلی ہی نظر میں آپ کو پہچان لیا تھا۔ لیکن محبت کو کلیجہ سے لگا کر خاموش رہی۔ لیکن عاصمہ کے محبوب! اس کی راہ میں حائل ہونا میرے لئے ضمیر کی

ابد ہی لعنت ہے۔ میں اپنی تمناؤں کی دنیا اپنے پیروں سے پامال کرتی ہوں اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتی ہوں آپ کو چاہیئے کہ مجھکو میرے ارادے سے ہٹانے کی کوشش نہ کریں"

یہ کہکر نسیم کچھ دیر ساکت رہی۔ پھر بغیر کوئی بات کئے تیزی سے اُٹھی مکان کے اندر جا کر سانو لو کو ساتھ لیا اور تانگہ پر بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔

عاصمہ نے اس عرصہ میں نسیم کو کئی بار تلاش کیا۔ مگر اس کو موجود نہ پایا۔ سوتے وقت وہ پھر اس کے کمرہ میں آئی کونہ کونہ دیکھ ڈالا اور جب کچھ پتہ نہ چلا تو مجبوراً واپسی کا قصد کیا۔ ناگہاں اس کی نظر زمین پر پڑے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی۔ جس پر جمال کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ وہی خط تھا جو جمال نے نسیم کو بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ اور وہ عجلت میں اس کو بھول گئی تھی۔ عاصمہ نے خط اُٹھا کر پڑھا۔ انداز تحریر پر قلب سے دھواں اُٹھنے لگا۔

"نسیم! جمال کی تجھ پر یہ مہربانیاں۔ تو نے مجھ سے ذکر تک نہ کیا۔ کہہ دیتی تو کیا میں تجھکو روک دیتی۔ شاید چھپانا مقصود تھا۔ میں اُسی دن کھٹکی تھی جب اس کا نام لیتے وقت تیری آواز بھرا گئی تھی۔ کیا تو اس کو چاہنے لگی ہے میرا کچھ خیال نہ آیا"

دیر تک وہ اسی خیال میں اُلجھی رہی۔ پھر آہیں بھرتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی۔ اور پلنگ پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگی مگر نیند کسی طرح نہ آئی۔ آدھی رات کے قریب پھر اُٹھی۔ اور نسیم کے کمرے کا رُخ کیا۔

دروازہ اب تک کھلا ہوا تھا۔ سانو لو ایک پلنگ پر سو رہی تھی۔ اور نسیم بھی بظاہر اپنی مسہری پر غافل تھی۔ وہ دبے پاؤں داخل ہوئی۔ اور نسیم کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا منھ تکیہ پر رکھا ہوا تھا۔ اور تکیہ آنسوؤں سے ڈوب چکا تھا۔ یہ دیکھکر عاصمہ کے لئے وہاں ٹھہرنا قابو سے باہر ہو گیا۔ اور وہ خاموشی سے ہلکے قدم اُسی طرح واپس ہو گئی

باب ۱۸

نسیم کی علالت کی خبر آن واحد میں ساری کوٹھی میں پھیل گئی۔ ہر چھوٹا بڑا ملازم اپنے ہر دلعزیز مہمان کے لئے پریشان تھا شہر کے مشہور ڈاکٹر سراج حسین کا علاج تھا۔ مگر بخار کسی طرح ۱۰۴ ڈگری سے کم نہ ہوا۔ ۴۸ گھنٹے کی مسلسل غفلت کے بعد اس کو ہوش آیا۔ لیکن چند گھنٹوں میں حرارت پھر بڑھ گئی۔ وزیر اعظم کی توجہ اور سانولو کی شب بیداری کے نتیجہ میں طبیعت چوتھے روز کچھ بحال ہوئی اور وہ کچھ کھانے کے قابل ہو سکی معمولی طور پر دودھ اور فواکہات سے ناشتہ کر کے اس نے سانولو سے کہا۔

"کئی دن سے میں نے عاصمہ کو نہیں دیکھا"

"جب سے میں آئی ہوں وہ ایک دفعہ بھی نہیں آئیں" سانولو نے جواب دیا "کوٹھی کے ہر چھوٹے بڑے نے آپ کی خیریت دریافت کی۔ اگر کسی نے نہیں پوچھا تو صرف عاصمہ بی بی نے۔ دو مرتبہ اُدھر سے دوا لینے بھی گئی۔ ان کو خورشید میاں کے ساتھ ٹہلتے دیکھا۔ میرے سلام کا جواب دینے کے علاوہ انھوں نے کوئی بات نہ کی"

سانولو کے بیان سے نسیم کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اور ہاتھ ماتھے پر رکھ کر

کہنی تکیہ کے سہارے ٹکا دی۔ مالکہ کو پریشان دیکھ کر سانولو بھی پریشان ہوگئی اور بیتاب ہو کر کہنے لگی۔

"بی بی۔ ابھی آپ بیماری سے اُٹھی ہیں۔ اپنے کو ہلکان نہ کیجئے۔ دیکھنے نہیں آئیں۔ تو نہ آئیں۔

"سانولو! تم میری خادمہ ہو اور بچپن کی سہیلی بھی۔ میرے ہر راز سے کم و بیش واقف ہو۔ میں نے تم سے صرف ایک بات چھپائی تھی۔ اول تو اس کے اظہار کا موقع ہی نہیں آیا اور موقع آتا بھی تو فی الحال نہ کہتی مگر حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ مجھے تم سے کہہ دینا چاہیئے۔"

یہ کہکر نسیم اس کے چہرے کو بہ نظر غائر دیکھنے لگی۔ پھر اک دم سنبھل کر اس طرح بیٹھ گئی۔ گویا سوتے سوتے چونک پڑی ہو اس نے سانولو کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ قریب پہنچی تو اس کے داہنے رخسار پر انگلی رکھکر غصہ کی آواز میں چلائی۔

"سانولو! تو بدچلن ہو گئی ہے۔ یہ داغ کیسا ہے کم بخت! اگر جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ تو مجھ سے کہہ دیتی میں تیری شادی کر کے آئی ہوتی۔ نشان تازہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو نے یہاں آکر میرے نام کو دھبہ لگایا

نسیم کا نفس تیز ہو گیا۔ سانولو اس کے قدموں پر سر جھکائے گنگا جمنا بہاتی رہی اور دبی زبان سے اتنا کہہ سکی

"میں گنہگار ہوں۔ مگر آپ میری بھی سُن لیں۔ ممکن ہے اپنی صفائی کر سکوں۔"

اس کے کہنے پر نسیم قدرے نرم پڑی۔ اس کا سر اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور سانو لو نے کہنا شروع کیا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ میں نے کوٹھی سے باہر قدم نہیں نکالا۔ تیمارداری ہی سے چھٹی نہیں ملی۔ کہیں جاتی تو کس وقت"؟

"واقعہ نہیں بتاتی۔ اِدھر اُدھر کی اُڑا رہی ہے"۔ نسیم اُکتا کر بولی لیکن سانو لو نے اپنا بیان جاری رکھا۔

"وزیر اعظم اکثر رات گئے آپ کو دیکھنے آتے تھے۔ اور مجھ سے آپ کی باتیں کر کے چلے جاتے تھے۔ ان کا برتاؤ میرے ساتھ لونڈیوں کا سا نہ تھا جس کو میں آپ کے خلوص پر محمول کرتی رہتی۔ پرسوں کی رات جب آپ سو گئیں وہ آئے اور مجھے ڈرائنگ روم میں بلاتے گئے۔ میرا کمرے میں داخل ہونا کہ انھوں نے جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا۔ میں بدنامی کے خیال سے چیخ بھی نہ سکی۔ مگر چھڑانے کی جدوجہد کرتی رہی۔ اُن سے کچھ اور بن نہ پڑا تو اپنے دانت میرے رخسار میں پیوست کر دیئے۔ بارے میں نے داڑھی نوچ کر اپنے کو چھڑا لیا اور بھاگ کر آپ کے پلنگ کی آڑ میں چھپ رہی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے آئے اور آرام کرسی پر بیٹھ کر مجھکو بہت لالچ دیا۔ بی بی۔ میں بھی اُس وقت غصہ میں تھی۔ ان کو ہزاروں صلواتیں سنا ڈالیں۔ مگر وہ اپنی کہے گئے۔ کہتے تھے کہ میں اُن کے ساتھ نکاح پر تیار ہو جاؤں"۔

"اُس خبیث کی خبر کیوں نہ لی تو نے۔ مجھ ہی کو جگا دیا ہوتا"۔ نسیم نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔

"جگالی تو اُس وقت. جب میں اپنے کو کمزور سمجھتی"۔ سانولو نے جواب دیا"
نسیم کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اس کو بوڑھے وزیر کی حرکتوں پر ہنسی آرہی تھی۔ مگر وہ سنجیدہ بنی بیٹھی رہی۔ پھر سانولو سے کہنے لگی۔

"تو تم اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں"؟

"نوج۔ میں اُس کھوسٹ کے ساتھ بیاہ کروں"۔ سانولو نے بگڑ کر کہا مگر نسیم نے پھر اصرار کیا۔

"کیوں؟ ہرج ہی کیا ہے۔ دھن۔ دولت۔ عزت کیا نہیں ہے۔ وزیر اعظم کی بیوی بنو گی برابر کا درجہ رکھو گی"۔

"مجھے یہ باتیں نہیں بھاتیں۔ جب آپ ہی یوں کہتی ہیں۔ تو دوسرے کیوں نہ کہیں گے"!

سانولو کے بگڑنے پر نسیم کو اور لطف آیا اور اس نے چھیڑتے ہوئے پھر کہا۔

"اگر میری خواہش ہو"۔

"دواجان کر زہر پی لوں گی"۔ سانولو نے سپر انداختہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ مگر نسیم اب بھی باز نہ آئی وہ آج اُس غریب کو ستانے پر تلی ہوئی تھی۔ کہنے لگی

"جب وزیر اعظم کے سے زاہد صد سالہ تمھارے نمک پر لٹو ہو گئے تو میں بیچارے منشی کو کیا کہوں" "وہ تو ابھی نوجوان ہے"۔ اور سانولو کے جھینپنے پر اس نے اضافہ کیا

"اپنی یہ ادا وزیر اعظم کو دکھاتیں تو مزا بھی تھا۔ مجھ پر اس کا کیا اثر ہوگا

نسیم جب کسی طرح چپ نہ ہوئی تو سانولو بھی مقابلہ میں ڈٹ گئی۔ اس نے جواباً اپنا بھرپور وار کیا

"مجھکو آپ بہت کہتی ہیں۔ ذرا اپنی خبر لیجئے۔ خورشید میاں ابتک تنکے چن رہے ہیں"۔

داستاں گو نے سنایا حال قیس
کیا کہوں کیا کیا خیال آنے لگے
ناصری

تیر نشانے پر بیٹھا۔ جمال کے متبسم مکھڑے کا تصور نسیم کے کلیجہ سے آلگا اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ سانولو نے اس تغیر کا احساس کیا اور کہنے لگی۔

"آپ اس وقت کچھ کہنے جا رہی تھیں۔ درمیان میں یہ قصہ در پیش ہو گیا"

"سانولو! تم نے جمال کو تو دیکھا ہی ہے۔ کیسے ہیں وہ"؟ نسیم نے اپنی عزیز خادمہ سے استفسار کیا۔

"وہی نا۔ جن کے مکان سے آپ مجھ کو لائی تھیں"۔ سانولو نے جواب دیا

"ایسے ہیں کہ وہ سامنے ہوں اور انھیں دیکھا کرے کوئی" "عاصمہ مدت سے اس پر مٹی ہوئی ہے۔ میں نے یہاں آکر دوسری بار ان کو دیکھا۔ کیا کہوں سانولو۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی پہلے پہل ابا جان کی زندگی میں جب عالم کو دیکھنے گئی تھی تو تم بھی ساتھ تھیں۔ وہ ملک صورت نوجوان جس نے دریا کے کنارے میری جان بچائی تھی۔ یہی جمال تھا جو میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے"۔

"کیا عاصمہ کو آپ کی محبت کا حال معلوم ہے"؟ نسیم کی بات کاٹ کر سانولو نے دریافت کیا۔

"مقدور بھر تو میں نے چھپایا۔ مگر قرینہ کہتا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھ چکی ہے جمال کا وہ خط جس میں اس نے تمہارے متعلق لکھا تھا۔ کہیں کھو گیا ہے اور غالباً عاصمہ اس کو پا گئی ہے۔ یہ کشیدگی اُسی کے باعث ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے اس کو یقین دلاؤں کہ میں نے صرف اس کی خاطر دل پر پتھر رکھ کر جمال سے بد اخلاقی کی"۔ نسیم نے کہا۔

"آپ کو اُن کی اتنی فکر کیوں ہے"؟ سانولو نے کہا

"اس کا عشق جنون کی حد تک ترقی کر چکا ہے۔ اگر جمال نے چند دن اور بے اعتنائی کی تو عجب نہیں کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے"۔ نسیم نے سانولو کو سمجھایا!

وہ کچھ کہنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ایک والنٹیئر سادہ لباس میں کمرے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور ایک بند لفافہ اس کو دے کر اُلٹے قدم واپس ہوا۔ سانولو یہ اندازہ کر کے کہ خط جمال ہی کا ہے۔ خاموشی سے اپنی مالکہ کے خوشنما ہونٹوں کی جنبش اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی۔ نسیم خط پڑھنے میں لگ گئی اور دفور جذبات میں اس کے رخساروں پہ سرخی دوڑنے لگی

دل میں مرے بجز ترے اور کسی کا گھر نہیں
جلوہ گہ نیاز ہے۔ عام یہ رہگذر نہیں
ربط تلہری

نسیم اختر۔ سیاروں کی چالیں اور بادِ سحر کی اٹکھیلیاں تمھاری مستانہ روی کے تصدق۔ جمال کا شکستہ دل تمھاری نازک خرامی کے نثار۔ کس ادا سے آئیں اور کس بے اعتنائی سے واپس گئیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جس نے ہاتھ بھر کا کلیجہ کر کے بلانے کی ہمت کی اس کے دل میں کیا کیا ارمان ہوں گے کاش ایک مرتبہ استفسار کر کے پوری بات سن لی ہوتی۔ تو شاید اظہار تمنا کے بعد قلب کی ٹیسوں میں کمی ہو جاتی۔ سسکتے ہوئے زخموں پر نمک پاشی کر کے بھول ہی کر پرسش حال کر لیتیں تو درد کی اذیت میں تڑپنا گوارا تھا۔ مگر اے لبا آرزو کہ خاک شدہ۔ تم نے اُمید پوری کر کے ہمیشہ کو نا امید کر دیا۔

جیل کی چار دیواری میں تمھارے حسین مکھڑے کا تصور در و دیوار کی زینت رہا۔ رات کی تنہائیوں میں آسمان کے تارے تمھاری محبت کے پیغامبر رہے۔ مگر دل کا اضطراب کبھی ایسا نہ تھا کہ عقل و ہوش سے بیگانہ کر دے اور احساس زندگی چھین کر دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا دے۔ تمھارا دوسرا وار تمھاری نظر میں اوچھا سہی بھرپور پڑا اور جنون محبت کے ہاتھوں دیوانہ بنا کر رہا۔ اس روز تم نے مجھ کو محسن کہہ کر خطاب کیا۔ تمھارے نزدیک وہ بھولا ہوا واقعہ خواب سے زیادہ وقیع ہے اور تم اس کو ادائے فرض کے بدلے کسی احسان سے تعبیر کرتی ہو۔ حالانکہ حقیقت اس کے منافی ہے۔ اُس اتفاقی ڈرامے میں جمال ایک نا آشنائے درد الھڑ نوجوان کا کردار تھا اور نسیم ایک بے رنگ مگر حسین مجسمے کا نام تھا۔ میرا منشا یہ نہیں کہ تم خوبصورت نہ تھیں یا تم میں حسن کی دلفریبی نہ تھی بلکہ تمھارا حسن رنگینیوں کا منظر اور

تمھاری زلفیں مشاطۂ فطرت کی دست نگر تھیں۔ یا میرا بے شعور دل تمھارے جوانی بدوش لڑکپن کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمھاری چال اُس وقت بھی قلب زمین کی دھڑکن تیز کرنے کو کافی تھی مگر معاذ اللہ۔ یہ محشر زار رفتار۔ یہ قیامت خیز انداز۔ آسمان کی گردشیں قربان کس کے وہم و خیال میں تھیں۔ تم کو یاد ہوگا کہ اُن لٹیروں کے فرار ہو جانے کے بعد میں نے روداد واقعہ کے علاوہ کوئی بات بھی نہیں کی۔ حتیٰ کہ نام و پتہ بھی دریافت نہ کیا۔ عام حالات میں میرا اخلاقی فرض ہوتا کہ مکمل تعارف کی درخواست کروں لیکن باتوں میں یہ معلوم کر کے کہ تم عالم کی بہن ہو اپنے شخصی وجود کو تم پر ظاہر کر کے تمھاری نظر میں ذلیل ہونا تھا۔ اور اس موقع پر کچھ پوچھنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا۔ کہ میں کسی دوسرے وقت ملاقات کر کے ایک ادنیٰ خدمت پر داد طلب ہونے کا خیال رکھتا ہوں مجبوراً دل میں چبھے ہوئے کانٹے کو کھٹکتا چھوڑ کر تمھارے خیال کو بھول میں ڈالتا رہا میں اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوا۔ اس کو شاید تم سمجھ نہ سکو گی تمھاری شرافت نفس ہے کہ تم نے اب تک مجھے یاد رکھا۔ مگر سچ کہنا۔ اگر میرا یہ فعل تمھاری ممنونیت کا باعث تھا تو اس کے معاوضہ میں تم کو یہی کرنا تھا۔ کہ مجھکو زلفوں کی کالی بلائیں پھنسا کر مفارقت کی صعوبتیں برداشت کرنے کو چھوڑ دو۔ اور قطع تعلق کا ناطق فیصلہ کر کے حوصلوں کو پست کر دو۔

تمھاری نشیلی انکھڑیوں کے خیال میں راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ سوچا تھا کہ شاید تمھارے نام کی برکت سے دل اختر شماری میں بہل جائے۔ مگر اس طرح

بھی قرار نہ آیا۔ تم کو عاصمہ کی محبت کا خیال ہے۔ مگر میری زندگی کی فکر نہیں
تم سمجھتی ہو کہ تمھاری بے رخی سے میرا دل عاصمہ کی طرف کھنچ جائے گا۔
لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہی ہوتا تو آج میں تمھارا پرستار ہونے کے
بجائے عاصمہ کا اسیر ہوتا۔ وہ دن میری نظر میں ہے جب وہ میری بے
رونق دنیا میں گلاب کا پھول لے کر جنت نظیر بنی اور میں نے اس کی حسن
نمائیوں کو جذبات کی گہرائیوں میں جگہ دی۔ میری معصوم نسیم۔ تمھارے
مصحف رخ کو درمیان دے کر کہتا ہوں کہ دل اس کے خلوص سے
متاثر ہوا۔ نظر اس کی رعنائیوں کی قدرداں ہوئی مگر محبت کا جذبہ ہزار
بار پیدا کرنے کے باوجود پیدا نہ ہو سکا اس لئے نہیں کہ وہ محبت کے قابل
نہ تھی بلکہ اس لئے کہ میرے پاس وہ دل ہی نہ تھا جو اس کی نذر کے لائق
ہوتا مجھے تو اس کے شباب کے جلوؤں میں تمھارے حسن کی تابانی نظر آتی
تھی۔ یہ ذکر اُس وقت کا ہے۔ جب میں ہجر کے آلام پر حاوی اور درد کی
اذیتوں پر قادر تھا۔ تم نے عاصمہ کے جذبات پامال ہونے کا بدلہ لیا اور خون
آرزو کے انتقام میں نیم بسمل کر کے چھوڑ گئیں۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں
محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ناقدری کے خمیازے میں دائمی فرقت کی
مصیبتیں جھیلنا پڑیں گی۔ مگر سب کچھ جانتے ہوئے بھی دل بیقرار قابو میں
نہیں آتا۔ اگلا جمعہ ستیہ گرہ کا دن ہے۔ حالات سے تم بھی واقف ہو۔
انجام عالم الغیب جانتا ہے۔ صورت حال وطن پرستوں کو موت کا پیغام
دیتی ہے۔ حسرت ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار جی بھر کر تم کو دیکھ لوں۔

بلانصیب

جمال

نسیم نے خط پڑھ کر تکیہ پر رکھ دیا اور برسی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر سانولو کو دیکھنے لگی۔ باوفا سانولو نے بھی مضطرب ہو کر اپنی نگاہیں مالکہ کے چہرے پر جما دیں۔ آخر نسیم نے مہر سکوت توڑی اور کہنے لگی۔

"سانولو! جمال کے پاس چلی جاؤ اور کہہ آؤ کہ رات کو دس بجے شاہی پارک میں میں اس کا انتظار کروں گی" لیکن خبردار کسی کو کان و کان خبر نہ ہو"

سانولو تعمیل میں اُٹھی اور کمرہ سے باہر نکل گئی۔ نسیم تنہائی پاکر پھر اپنے محبوب کے خیال میں غرق ہو گئی۔
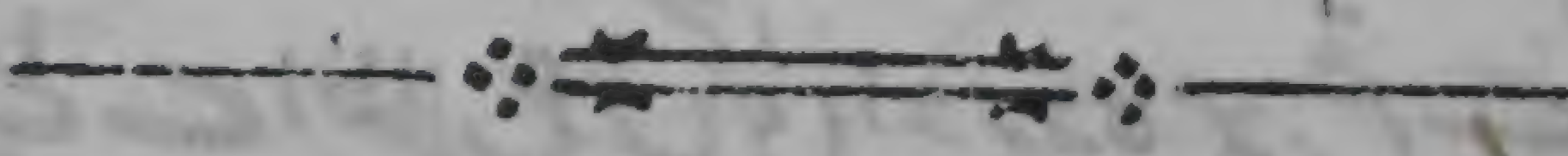
باب (۱۹)

آٹھ بجے شب کا وقت ہے۔ وزیر اعظم اپنے ڈرائنگ روم میں عالم سے ہمکلام ہے۔ وطن پرستوں کی شورش پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ شریف خاں کوتوال بھی موجود ہے۔ ابھی اس سے اور وزیر اعظم سے کچھ تلخ گفتگو کی نوبت بھی آچکی ہے۔ پچھلے پروگرام کے تحت جن لوگوں کے نام وارنٹ جاری کئے گئے تھے۔ ان کا گرفتار نہ ہو سکنا۔ عالم کی نظر میں کوتوال کی غفلت کا نتیجہ تھا۔ لیکن شریف خاں اس کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ان لوگوں کو پہلے سے اطلاع مل گئی اور وہ موقع سے ٹل گئے۔ وزیر اعظم اس بیان کو اپنی توہین سمجھتا تھا کہ اس کے گھر سے اس قسم کا راز فاش ہوگیا۔ عالم بھی اس کو کوتوال کا عذر لنگ خیال کرتا تھا لیکن دروغ گو کو اتنا حافظہ نہ تھا کہ کسی وقت مجذوب کی ٹبر میں خود اُسی نے نسیم اختر کے سامنے اس پروگرام پر تفاخر کیا تھا۔ بالآخر کافی ردوقدح کے بعد وزیر اعظم نے شریف خاں کو آئندہ کے لئے تنبیہہ کر کے جانے کی اجازت دی اور خود عالم سے مخاطب ہوا۔

"ہاں عزیزم یہ تو بتاؤ۔ تم نے جو آدمی بلائے ہیں۔ اُن سے اس سے قبل بھی کوئی کام لیا ہے؟"

"کیوں نہیں۔" عالم نے قدرے توقف سے کہا۔

چالاک وزیر نے اس کے پس وپیش کو محسوس کرتے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا

"غالباً تمھیں یہ بتا دینے میں تامل نہ ہوگا کہ وہ کام کس نوعیت کا تھا۔"

عالم اس کے جواب کے لئے تیار نہ تھا۔ فوری سوال پر کچھ گھبرا سا گیا۔ وزیر اعظم نے بھی اس کے اضطراب کا اندازہ کیا لیکن قبل اس کے کہ وہ مزید باز پرس کرے اردلی نے اطلاع کی کہ دو آدمی عالم میاں سے ملنا چاہتے ہیں۔"

عالم موقع کو غنیمت سمجھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور وزیر اعظم نے بھی مصلحتاً خاموشی اختیار کرلی۔ مگر چلتے وقت اتنی ہدایت کردی کہ اگر یہ آدمی وہی ہوں تو اسی وقت بات چیت کر کے رخصت کردینا اور صبح کو مجھ سے کل کیفیت بیان کرنا۔ عالم اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ دو آدمی دیہاتی وضع قطع میں اس کے منتظر تھے۔ ایک انگوچھے کا صافہ باندھے اور کسی قدر صاف کپڑے پہنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں قد سے دو ہاتھ اونچی لاٹھی تھی۔ دوسرا آدمی بہت کثیف دھوتی میں ملبوس تھا سر کی ٹوپی تیل سے چکنی ہو رہی تھی۔ ہاتھ میں کم وبیش ساڑھے تین ہاتھ لمبا اور ڈیڑھ انچ موٹے قطر کا ڈنڈا تھا۔ نیچے وزنی لوہے کا گولا لگا ہوا تھا۔ اور دستے پر لوہے کی پتی منڈھی تھی۔ سوت کی رسی کا ایک سرا دستے کی پتی اور بانس میں بنے ہوئے آر پار چھید سے گزر کر دوسرے سرے

سے اس طرح بندھا ہوا تھا کہ بہ آسانی ہاتھ میں لٹکایا جا سکے۔ یہ آدمی پہلے کی بہ نسبت نو عمر تھا اور دیہاتی وضع قطع کا بانکے معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال سے کم نہ تھی مگر چہرے پر قساوت قلب آشکار تھی۔ عالم کو دیکھ کر ان دونوں نے جھک کر سلام کیا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے کوٹھی کے متصل باغیچہ کی طرف چلے گئے۔ عالم وہاں پہنچ کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور یہ دونوں بھی اس کے اشارے سے نزدیک ہو بیٹھے۔

"آٹھ دس سال سے میں تم لوگوں کو بیٹھے بیٹھے تنخواہ دے رہا ہوں۔ مگر تم سے ایک خدمت بھی حسب دلخواہ نہ ہو سکی۔" عالم نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"حضور۔ کون سا کام ہم لوگوں کو دیا گیا جو ہم نے نہیں کیا۔" ایک شخص بولا۔

"آپ روز روز نسیم بی بی والے معاملہ کی شکایت کرتے ہیں مگر غور کیجئے تو اس میں ہم بے قصور ہیں۔" دوسرے نے کہا

"کیوں۔ بے قصور کیوں ہو؟ میں نے تو ہزار ترکیبوں سے اُس کو بُلوایا۔ اور ٹہلنے کے بہانے سے تم تک پہنچا بھی دیا۔ شکار منہ میں تھا۔ تم ہی بزدل نکلے ورنہ ایک وار میں خاتمہ تھا اور پانی میں ڈبو دینا تو کوئی کام ہی نہ تھا۔" عالم نے دونوں کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ مگر پہلا شخص پھر کہنے لگا۔

"حضور۔ بلا وجہ غصہ کرتے ہیں۔ ہم کیا کرتے وہ کمبخت جانے کدھر سے آگیا۔ آپ یہی کہیں گے کہ تم دو تھے وہ اکیلا تھا۔ مگر یہ بھی آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ بلدیو کے اسٹک پڑی۔ وہ زخمی ہو کر ٹھہر نہ سکا۔ میں اکیلا کیا کرتا۔ اگر جیوٹ کرکے لڑتا بھی تو گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم جیل سے نہیں ڈرتے

مگر جان بوجھ کر خطرے میں پڑا بھی نہیں جاتا۔"
"میاں وہ آدمی نہیں تھا۔ بھوت تھا۔" دوسرے نے پہلی کی تائید کی۔
"بلدیو۔ تم میں صرف چرب زبانی تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے پچاس مرتبہ بھیجا۔ مگر تم کو موقع ہی نہ مل سکا۔ دیکھنا ہے اس مرتبہ کیا کرتے ہو" عالم نے پانی چڑھانے کی کوشش کی۔
"ایشور نے چاہا تو ابکی شکایت نہ ہوگی۔" دونوں ہم زبان ہو کر بولے۔
عالم نے دونوں آدمیوں کے قول پر بشاش ہو کر پیٹھ ٹھونکی۔ اور کہا۔
"نسیم کو جس نے بچایا تھا۔ اور بلدیو کو زخمی کیا تھا۔ اس کا نام جمال ہے وہ آج کل یہیں رہتا ہے۔ اور تم کو اُسی کے لئے بلوایا گیا ہے۔
جمال کا نام سُن کر بلدیو کو طیش آگیا۔ اور وہ بڑبڑانے لگا۔
"ابکی میاں کو جیتا نہ چھوڑوں گا۔ اور بچ بھی گئے تو صورت ایسی بگاڑ دونگا کہ گھر والے پہچان نہ پائیں۔"
یہ کہکر اس نے اپنے چکنے ڈنڈے پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بھوانی کی طرف سرگوشی کے انداز سے دیکھنے لگا۔ بھوانی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا۔
"بھیا بلدیو! موقع تو خوب ہے۔ دل کھول کر مرمت کی جائے۔"
عالم دونوں کی باتوں پر دل ہی دل میں محظوظ ہوتا رہا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہنے لگا۔
"دیکھو یہاں سے قریب ہی ایک پہاڑی ہے۔ تم نے آتے وقت دیکھی ہوگی۔ کل اطمینان سے اس کی کسی کھو میں اپنے قیام کا انتظام کر لو۔ سہ پہر کو

میرے پاس پھر آنا۔ میں تم کو جمال کی قیام۔گاہ بتادوں گا مگر میرا منشا اس کو جان سے مار ڈالنا نہیں ہے۔ چاہتا یہ ہوں کہ وہ زندہ رہے مگر مردہ بن کر اس کے ساتھ ہی کچھ دنوں کے لئے اس کا شہر سے دور ہو جانا بھی ضروری ہے۔ تم اس کو اُسی پہاڑی پر چھپائے رہنا۔ اور وقتاً فوقتاً مجھ سے ملتے رہنا۔ تاکہ میں حالات سے باخبر رہوں"۔

بات ختم کر کے اس نے پچاس روپیہ کے نوٹ بلدیو کے ہاتھ رکھے اور مسکراتا ہوا وہاں سے چلدیا۔ بلدیو اور بھوانی بھی اُٹھے اور ایک تاڑی خلنے کا پتہ پوچھ کر باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ بھوانی نے کہا

"میاں نہ معلوم کس مزاج کے آدمی ہیں بیسوں مرتبہ نسیم کی جان لینے پر زور دے چکے ہیں اور ناراض الگ ہوتے ہیں، میں تو ایک مرتبہ کہتے کہتے رُک گیا کہ مجھ سے یہ کشٹ نہ ہوگا۔ نوکری کا معاملہ نہ ہوتا تو کہہ دیتا اور ایک نہ ایک دن کہنا ہی پڑے گا کہ پرانے مالک کی کنیا پر میرا ہاتھ نہ اُٹھے گا۔ بھیا بلدیو۔ تم تو ابھی جوان ہو۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ تمھارے باپ کے ساتھ بہت خون کئے اور کبھی ہمت نہ ہاری۔ مگر اُس دن سڑک پر جب تم نے نسیم کو پکڑا ہے اور وہ چلائی ہے تو کیا کہوں جیسے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا ارے یہ پاپ نہ کر"۔

بلدیو نے بھی اس کے خیال کی تائید کی اور کہا۔

"اچھا ہی ہوا کہ جمال نے اس کو بچا لیا۔ مگر کاکا! یہ سر کی چوٹ"!

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ چاند پر پہنچا اور منھ سے بے ساختہ گا[...] نکل گئی۔ بھوانی بھی بلدیو کی مار کا تصور کر کے مشتعل ہوا اور دونوں جمال کا

لے لے کر مغلظات سنانے لگے۔

عالم کے چلے جانے کے بعد وزیر اعظم کرسی سے اُٹھ کر ٹہلتا رہا۔ اور کمرے کے دروازے تک آیا۔ پھر کچھ سوچ کر واپس ہوا۔ اپنی جگہ پر بیٹھ کر اردلی کو آواز دی اور حکم دیا کہ سانولو کو بلا لائے۔ نسیم اور سانولو کہیں جانے کو تیار تھیں۔ اردلی کو آتا دیکھ کر چوکنا ہو گئیں۔ لیکن جب وہ سانولو کو طلبی کی اطلاع کر کے واپس ہو گیا تو دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور سانولو نے معنی خیز انداز سے نسیم کو دیکھا۔ نسیم نے مسکرا کر کہا۔

"جائیں کیوں نہیں۔ چاہنے والے نے بلایا ہے۔"

جواب میں سانولو بھی نہ چوکی اور کہنے لگی

"پہلے اپنی کہیئے کہ چہیتے سے ملنے کو بیقرار ہیں۔ ابھی نو بجے ہیں۔ مگر ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جانا چاہتی ہیں۔"

سانولو کے جواب نے نسیم کی رگ رگ میں ارتعاش پیدا کر دیا مگر اس نے ٹال کر کہا

"سانولو۔ اس بڈھے سے آج کچھ مذاق کرنا چاہیئے۔"

پھر اُس کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر چپکے چپکے کچھ کہتی رہی۔ اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں نسیم اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور وقت گذاری کے لئے ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ سانولو نے اُٹھ کر بکس کھولا۔ کوئی چیز ہاتھ میں دبائی اور ایک سگریٹ منہ میں لگا کر ہلکے ہلکے کش کھینچتی ہوئی۔ وزیر اعظم کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔

وزیر اعظم شوق کی نگاہ سے دروازے کو تک رہا تھا۔ سانولو کو آتا دیکھ کر

کھڑا ہو گیا۔ سانو لو نے کمرہ میں داخل ہو کر دونوں پٹ اندر سے بند کر لئے۔ اور نگاہیں ملا کر مسکرانے لگی۔ بوالہوس وزیر اس ادا پر اور بھی مر مٹا۔ اور جب وہ اس سے لگ کر کوچ پر بیٹھ گئی تو اس کی بیتابی دید کے قابل بن گئی۔ سانو لو کا سر اس کے شانے پر جھکا ہوا تھا اور وہ لائٹر سے بجھے ہوئے سگریٹ کو جلا رہی تھی مگر لو سگریٹ میں لگنے کے بجائے وزیر کی داڑھی میں لگ گئی۔ اور بیچ کا حصہ بالکل صاف کر گئی۔ سانو لو نے ارے کہہ کر بجھانے کے لئے منھ اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ہاتھ میں لگے ہوئے سیاہ مصالحہ نے چہرے کی جلد کو سیاہ کر دیا مگر عشق کے سودائی کو کچھ احساس نہ ہو سکا۔ تمام حرکتوں کو اس نے اس کی شوخی پر محمول کیا داڑھی جل جانے کا افسوس کرنے کے عوض اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر سانو لو کو بھینچ لینا چاہا۔ مگر وہ گرفت سے نکل گئی اور "ابھی آتی ہوں" کہکر دروازے سے باہر ہو گئی۔ اس نے باہر آکر اردلیوں کو اندر بھیج دیا اور خود سیدھی مالکہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ نسیم اس کی منتظر تھی ہی آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کی کارگزاری کا لطف لیتی ہوئی کوٹھی سے نکل کر ایک سمت کو روانہ ہو گئی۔ اردلی جب وزیر اعظم کے کمرے میں آئے۔ اور اس کی حالت دیکھی تو کسی سے ضبط نہ ہو سکا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ وزیر اعظم کو غصہ پر غصہ آیا اور بار بار اس نے ان بدتمیزیوں کی وجہ دریافت کی۔ مگر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ آخر کار ایک اردلی نے آئینہ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ آئینہ میں صورت دیکھکر وہ اور بھی مشتعل ہوا۔ ٹھڈی سے لیکر پیشانی تک کالی ہو رہی تھی۔ داڑھی کے کنارے دونوں طرف سگنل کی طرح اٹھے ہوئے تھے۔ اور

بیچ کا حصہ پلیٹ فارم کی طرح صاف تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ اپنی حالت کا اثر لیتا رہا۔ مگر پھر سانولو کی شوخیاں یاد کر کے تڑپ اُٹھا۔ اور سب کچھ بھول کر اس کے گداز جسم کے تصور سے لطف اندوز ہونے لگا۔

باب ۲۰

"سانولو" بھی "نسیم" کے ساتھ آئی تھی۔ مگر پارک کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اس نے جمال کے قدموں کی چاپ پائی اور خندق کے قریب آڑ میں ٹھہر گئی۔ تاکہ اس کا وجود تخلیہ میں مخل نہ ہو۔ اس کے ماسوا ملاقات کی پردہ داری بھی ملحوظ تھی۔ اگر وہ کسی کو اس طرف آتا دیکھتی تو اپنی مالکہ کو خبردار کر سکتی تھی نسیم نے اس کو ٹھٹھک کر رکتے ہوئے دیکھا۔ کچھ کہنے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر ہلکے قدم آگے بڑھ گئی۔ جمال ٹہل ٹہل کر انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ سبک گام نسیم کی آہٹ پاکر وہ دیوانہ وار چلا اور اپنی حسرتوں کی دنیا کو کھلی ہوئی آغوش میں لے لیا۔ نسیم لاکھ سنبھلی مگر جذبات کی رو میں نسوانیت کے قدم جم نہ سکے۔ اس کے لب جمال کے لبوں سے مل گئے اور فردوس کی لذتیں رگ رگ میں سرائت کرنے لگیں آخر وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر الگ ہوئی۔ لجائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور جمال اس کے نرم نرم ہاتھوں کو محبت سے دبا کر گویا ہوا

"الٰہی۔ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقتاً میری نسیم مجھ پر مہربان ہے۔"

"خواب نہیں۔ ہے تو عالم بیداری۔ مگر آپ کی باتیں دیوانوں کی سی ضرور ہیں" نسیم نے مسکرا کر کہا۔

"میری دیوانگی میں شک ہی کیا ہے جب دیوانہ بنانے والا سامنے موجود ہے"۔ جمال نے جواب دیا۔

"شاعری کو کنارے رکھئے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے اُس عورت سے اظہار عشق کیا ہے جس کو آپ صرف رسمی طور پر جانتے ہیں کیا آپ کا اخلاق اسی کی اجازت دیتا ہے۔ کہ اس کی تنہائی سے ناجائز فائدہ اُٹھائیں۔ یہ خیال بھی نہ ہوا کہ کوئی دیکھ لیگا تو اس کی عصمت پر حرف آئے گا"۔ نسیم نے متانت سے کہا۔

"میں پشیمان ہوں نسیم۔ خدا جانے تمھیں دیکھکر مجھے کیا ہو گیا۔ کہ مجھ پر وارفتگی سی طاری ہو گئی"۔

یہ کہکر جمال نے اپنا سر نسیم کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ اور اس کو اشک کے قطرے بہتے ہوئے محسوس ہوئے۔ دونوں ہاتھوں سے پیشانی پکڑ کر اس نے جمال کا سر اوپر اُٹھایا۔ دیکھا کہ آنکھیں ملتجیانہ انداز میں کھلی ہوئی ہیں۔ وہ بھی اس کی بیقراری پر صبر کھو بیٹھی مگر ضبط سے کام لیا۔ ہاتھوں کو وفورِ محبت میں آنکھوں سے لگا کر کہنے لگی

"جمال، تم سچ مچ رنجیدہ ہو گئے۔ اچھا۔ اب میں کچھ نہ کہوں گی"۔

"جب تک معاف نہ کر دو گی۔ مجھے قرار نہ آئے گا"۔ جمال نے اندوہگیں لہجہ میں کہا

"اچھا۔ معاف کیا میں نے مگر اب کبھی ایسا قصور نہ کرنا"۔

یہ کہتے ہوئے نسیم کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور دل کی بھڑاس نکل جانے سے جمال کے جذبات میں بھی یکسوئی ہو گئی۔ اس نے پیار بھرے لہجہ میں

مخاطب کیا۔

"نسیم۔ آج میں سمجھ رہا ہوں کہ زندگی کی رونقیں صرف میرے لئے بنی ہیں۔"

"جمال" نسیم کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"کہو کہو، میری جان و روح خاموش کیوں ہو گئیں"۔ جمال نے سہارا دیا۔

"یہ محبت خدا جانے کیا کرنے والی ہے۔ میرا دل خود بخود بیٹھا جا رہا ہے"۔ نسیم نے جملہ پورا کیا۔

"کیوں؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ کوئی قوت مجھکو تمھارے خیال سے پھرا بھی سکتی ہے"

جمال نے مردانہ شان سے یقین دلایا

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ مجھکو عاصمہ کی فکر ہے۔ وہ غریب کڑھ کڑھ کر جان دیدے گی"۔ نسیم نے تشویش ظاہر کی پھر کچھ رُک کر آپ ہی آپ کہنے لگی

"میں اس کو کیا منھ دکھاؤں گی"

اس کا سر جھک گیا۔ جمال بھی سوچ میں پڑ گیا۔ بڑی دیر تک یہ محب و محبوب اپنی اپنی مشکلات پر غور کرتے رہے۔ آخر جمال نے طلسم خاموشی کو توڑا اور کہنے لگا۔

"پرسوں کا جھمیلا اصل خیر سے نپٹ جائے تو عاصمہ سے مل کر یکسوئی کی کوشش کیجائیگی

لیکن نسیم کا کسی طرح اطمینان نہ ہو سکا۔ بلکہ پریشانی اور بڑھتی گئی۔ یہ دیکھ کر جمال نے پہلی ملاقات اور پچھلی زندگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ گذرے ہوئے واقعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک نے دوسرے کی بیوفائی کا شکوہ کیا حتیٰ کہ ایک بجے کے قریب سالو نے آکر کہا

"رات بہت ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو کچھ پوچھ گچھ ہو"

اس کے کہنے سے نسیم اور جمال دونوں اُٹھے اور پارک سے نکل کر ہاتھ میں ہاتھ

ڈالے ہوئے کوٹھی کی طرف چلنے لگے قریب پہنچکر جمال نے نسیم کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگالیا اور محبت کی الوداعی مہر ثبت کردی نسیم نے ایک لفافہ میں اپنی خوشنما تصویر رکھکر پہلی ملاقات کی نذر پیش کی اور جمال کو مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی رخصت ہوگئی

جمال کو اپنے قیام گاہ پر پہنچنے کیلئے کافی فاصلہ طے کرنا تھا۔ لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا وہ سیدھی سڑک پر چلنے لگا۔ تھوڑی دور پر اس کو دو آدمی آگے آگے جاتے نظر آئے۔ اور اپنا نام بھی کان میں پڑا۔ کچھ قریب پہنچا تو گالیوں کی آواز بھی سنائی دی۔ اس نے شائستہ لہجہ میں اُن راہگیروں کو خطاب کیا

"کیوں بھئی۔ جمال نے تمھارا کیا بگاڑا ہے جو اس سے اتنا ناراض ہو"

بلدیو اور بھوانی اس کی آواز پر چونکنا ہوئے۔ کیونکہ دراصل یہ دونوں وہی تھے اور عالم سے رخصت ہو کر بات چیت کرتے ہوئے جارہے تھے جس کا تذکرہ پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ رات کے سناٹے میں بلدیو اپنے کو حاکم مطلق سمجھ کر تحکمانہ انداز سے بولا

"تم کون ہو۔ ہمارے بیچ میں دخل دینے والے؟

"سر راہ اس طرح بُرا بھلا کہتے دیکھکر پوچھ لیا تو کوئی گناہ نہیں کیا" جمال نے جواب دیا۔

اب بلدیو نے سر سے پیر تک اس کو دیکھا اور پہچان کر بولا۔

"شاید تمھارا ہی نام جمال ہے"

جمال نے اثبات میں جواب دیا۔ مگر ابھی اس کی بات پوری ابھی نہ ہوئی تھی کہ گالی کی صدا کے ساتھ بلدیو کا ڈنڈا فضا میں چمکا اور جمال کے بائیں شانے کو توڑ کر زمین پر آلگا۔ گرتے گرتے جمال نے اپنی چھڑی سے بھوانی کی ٹانگ مضروب کردی۔

لیکن بلدیو کے دوسرے وار نے اس کے نچلے دھڑ کو بھی بیکار کر دیا اور وہ چوٹوں کی شدت سے چور ہو کر بیہوش ہو گیا۔ بلدیو نے کاندھے سے لپیٹنے کا بورا اُتار کر جال کو گٹھری بنا کر باندھ لیا اور پیٹھ پر لاد کر روانہ ہو گیا۔ بستی سے نکل کر بھوانی نے پوچھا

"کدھر چلنے کا ارادہ ہے؟ بلدیو بھیا۔"

"میرے خیال میں تو پہاڑی پر چل کر دم لینا چاہیئے۔" بلدیو نے مشورہ دیا۔

"اچھا تو یہی ہے۔ وہاں تمام خطروں سے بچے رہیں گے۔" بھوانی نے تائید کی

"آج بڑے اچھے سمے سے چلے تھے۔ کہ محنت نہیں کرنا پڑی اور شکار سامنے آگیا۔" بلدیو فخریہ کہنے لگا۔ اس پر بھوانی بولا۔

"بڑے بھاگ والے تھے جو ایسے کو زیر کر لیا۔ میری تو ٹانگ ہی ٹوٹ گئی تھی۔ کھودا اور اچھا پڑا اور میں بچا رہے گیا۔"

"کاکا۔ جی میں تو آیا تھا کہ ٹھنڈا کر دوں بچا کو۔ پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔" بلدیو نے ڈینگ ماری لیکن بھوانی نے سمجھایا

"جان لینے سے کیا فائدہ۔ اپنا بدلہ بھی لے لیا اور میاں کا کہا بھی ہو گیا۔"

یہ دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے صبح صادق کے وقت دامن کوہ میں پہنچے اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگے۔ روشنی اچھی طرح پھیل چکی تھی۔ بلدیو بورا لادے ہوئے آگے آگے اور بھوانی سہارا دیتا ہوا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر بھوانی کو کچھ آدمی باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے بلدیو کو روک کر راستہ کترا دینے کا اشارہ کیا۔ وہ داہنی طرف مڑ کر آڑ میں ہو گیا۔ مگر چند قدم پر ایک کھو کے دہانے پر چار پانچ آدمی اور مل گئے اور ان دونوں کو گھیر لیا۔ بھوانی نے فرار کا

ارادہ کیا۔ مگر دو آدمیوں نے اس کو پکڑ لیا۔ بلدیو نے جبراً و قہراً بورا زمین پر رکھ دیا۔ اور اپنے کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ محمود خاں نے ایک آدمی کو بھیج کر کندھئی سنگھ کو بلا بھیجا اور خود چوری کا مال سمجھ کر بورا کھولنے لگا۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ سانو لو کی گرفتاری کے بعد جمال نے ان لوگوں کو جنگل چھوڑ دینے کی ہدایت کی تھی۔ اُسی وقت سے یہ گروہ اسی پہاڑی پر مقیم ہے۔ چند منٹ میں کندھئی سنگھ بھی آ گیا۔ اتنی دیر میں بورا کھُل چکا تھا۔ اور اُس میں سے کسی سامان کے بجائے۔ ایک لاش برآمد ہو چکی تھی۔ کندھئی سنگھ کی نظر جیسے ہی چہرے پر پڑی اس نے بیتاب ہو کر ناک اور منھ پر ہاتھ رکھا اور خوشی سے چلّا اُٹھا۔

"بھیّا ابھی زندہ ہیں۔ سانس جاری ہے"۔

رضا کاروں نے جمال کو اسٹریچر پر ڈال کر اُٹھایا۔ اور ایک کھو میں لے جا کر ڈریسنگ شروع کر دی۔ بھوانی اور بلدیو رسیوں سے جکڑ کر ڈال دیئے گئے۔

تھوڑی دیر بعد جمال کو ہوش آ گیا۔ اس نے متحیر ہو کر پوچھا

"میں کہاں ہوں"؟

کندھئی سنگھ نے مختصر الفاظ میں پورا واقعہ بیان کر دیا۔ اور جمال کے لئے کچھ دودھ اور میوے پیش کئے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر اس نے بلدیو اور بھوانی کو طلب کیا۔ چوٹیں گو بہت سخت آئی تھیں اور خون بھی کافی نکل گیا تھا جس سے اسکو کمزوری سی آ گئی تھی لیکن جسم کا کوئی عضو معطل نہ ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اُٹھنے بیٹھنے کے قابل نہ تھا لیٹے لیٹے اس نے بلدیو کے چہرے پر نگاہیں جمائیں۔ اور متبسم ہو کر پوچھا۔

"تمھاری صورت کچھ پہچانی ہوئی معلوم ہوتی ہے"۔

"دیکھا ہوگا کہیں آپ نے" بلدیو نے جواب دیا
"تمھارا نام کیا ہے؟ یہیں کے رہنے والے ہو" جمال نے پھر دریافت کیا
بلدیو نے اپنا اور بھوانی کا نام و پتہ بتا دیا اور مزید استفسار پر یہ بھی کہدیا
کہ آپ نے مجھکو زخمی کیا تھا۔ میں نے اپنا عوض لے لیا" اب جمال کا ماتھا
ٹھنکا۔ بلدیو کا لہجہ اس کو یاد آگیا لنسیم کا واقعہ نگاہوں میں پھر گیا۔ اس نے پھر
سوال کیا۔

"شاید تمھیں لوگوں نے دریا کے کنارے لنسیم پر حملہ کیا تھا"؟
بلدیو نے پہلے تو اس کا کچھ جواب نہ دیا لیکن جب جمال نے وعدہ کیا کہ صحیح
صحیح بیان کر دینے پر اس کے ساتھ رعایت کی جائے گی تو اس نے عالم کا پورا
واقعہ کہہ سنایا اور جرح میں اس کی تفصیلات بھی اُگل دیں۔ جمال نے
ان دونوں کو حراست میں رکھنے کی تاکید کر کے کندھی سنگھ کی طرف توجہ کی
اور رضاکاروں کی تفصیلات معلوم کر کے ہدایت کی کہ کل صبح کو عام لباس
میں روانگی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اسلحہ بھی پوشیدہ طور پر ساتھ لئے جائیں
مگر ان کے استعمال کی اجازت نہ ہوگی۔ دوسرے سامان کے ساتھ وہ بھی
وہاں پہنچکر محفوظ کر دیئے جائیں گے۔ تمام انتظامات کر کے اس نے تھوڑی
دیر آرام کیا۔ اور پھر سر شام چھڑی کے سہارے باہر نکل کر کچھ تفریح بھی کی۔
لیکن کمزوری کے باعث زیادہ چل پھر نہ سکا۔ مجبوراً اپنی جگہ پر واپس آکر
لیٹ رہا۔ اور بھوک ہڑتال کے پروگرام پر غور کرتے کرتے غافل سو گیا۔

باب ۲۱

عزیزالدین اور رام پرکاش نے ذرہ ذرہ چھان ڈالا۔ کرامت حسین نے چپہ چپہ میں تلاش کیا۔ مگر جمال کا کچھ سراغ نہ ملا۔ دوپہر ہوتے ہوتے اس کی گمشدگی کی خبر ہر خورد وکلاں کی زبان پر تھی۔ ہر شخص متفکر اور پریشان تھا۔ دن گزر کر شام ہوگئی تو عزیزالدین نے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کیا اور ستیہ گرہ کی کارروائی کی بابت مشورہ کیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ جب تک جمال کا پتہ نہ چل جائے۔ یہ تحریک ملتوی رکھی جائے۔ مگر بیشتر لوگوں کی یہی رائے ہوئی کہ ہم کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے۔ ورنہ اراکین حکومت یہی سمجھیں گے کہ صرف جمال کی ذات پر شورش کا انحصار ہے۔ اور اگر وہ ان کے سازسے گم ہوا ہے تو جلد اس کی واپسی کی امید بھی منقطع ہو جائے گی۔ رام پرکاش نے تائید کی۔ پروگرام مرتب ہوا اور ۸ بجے صبح کو دفتر کے سامنے اجتماع عام کا اعلان کردیا گیا۔

وزیر اعظم کی کوٹھی میں بھی جمال کے لاپتہ ہونے کا چرچا تھا۔ چھوٹے بڑے ملازم سب اس کو وزیر اعظم کی شرارت سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس کا چہرہ یہ خبر مشتہر ہونے کے بعد سے اتنا بشاش تھا کہ ایک بچہ بھی اس کی قلبی مسرت کا اندازہ کرسکتا تھا۔ عالم اپنی اپنی کارروائی پر نازاں تھا۔ بظاہر وہ خاموش تھا۔ مگر اس کا سینہ تان کر چلنا کارگذاری کا غرور ثابت کر رہا تھا اور جب وزیر اعظم سے اس کی نظریں چار ہو جاتیں تو کچھ خفیہ اشاروں کے بعد دونوں کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ عاصمہ

یونہی کچھ کم ملول اور افسردہ نہ رہتی تھی۔ تنہائی میں وقت گذاری اس کا معمول تھا۔ اس نے بھی یہ خبر کلیجہ تھام کر سنی۔ خدا کو یاد کیا اور ایک آہ بھر کر آسمان کو دیکھتی ہوئی خلوت کدہ میں داخل ہوگئی۔

نسیم اختر کی حالت قابل ذکر ضرور ہے۔ رنج وافسوس جو کچھ بھی ہوا کوئی دیکھنے والا اس کا اندازہ نہ کر سکا مگر اس کی اضطرابی بیان کی محتاج نہیں۔ زیادہ تشویش اور حیرت اس بات پر تھی کہ "ایک بجے رات تک وہ اس کے ساتھ رہا اور اس کے سامنے ہی بستی کی طرف روانہ ہوگیا۔ شاید وزیر اعظم کو اس کی ملاقات کا علم ہوگیا تھا اور اس نے آدمی لگا رکھے تھے۔ جنھوں نے راستہ ہی میں اُسے گرفت میں لے لیا لیکن علم ہوتا تو وہ اس سے یا کسی اور سے تذکرہ کرتا۔ ایسا نہیں ہے تو اس پر کیا افتاد پڑی؟ خدانخواستہ کسی نے مار ڈالا۔ تو دن بھر پچاسوں آدمیوں نے ڈھونڈھا۔ کہیں تو کوئی نشان ملتا۔" انھیں الجھنوں میں اس نے دن تمام کیا۔ سانو لو نے کئی مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی حالت میں کچھ تغیر نہ ہوا۔ رات کے کھانے میں وہ خاص طور سے شریک ہوئی۔ کہ ممکن ہے۔ وہیں سے کوئی پتہ چل جائے۔ مگر وہاں اس قسم کا کوئی تذکرہ ہی نہ آیا۔ عاصمہ کو موجود نہ پا کر اس نے عالم سے دریافت کیا۔ مگر معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت صبح سے کچھ خراب ہے۔ دن کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ نسیم کو ایک لمحہ کے لئے بھی وزیر اعظم کی صورت دیکھنا گوارا نہ تھا۔ مگر بادل ناخواستہ کھانا ختم ہونے تک اس کو برداشت کرنا پڑا۔ عاصمہ کی غیر حاضری کے وجوہ وہ سمجھتی تھی اور اس کو یہ بھی یقین تھا۔ کہ باپ جس پر نت نئے ستم توڑ رہا ہے۔ بیٹی اُسی کے غم میں اپنی ہستی کو مٹا رہی ہے۔ وہاں سے چھٹکارا پاتے ہی وہ اپنے کمرے میں پہونچی۔ اور

سانولو کو بلا کر نہایت تحمل سے کہنے لگی۔

"سانولو! میرا سامان باندھو اور سفر کی تیاری کر دو۔ میں ابھی تمھارے ساتھ چل نہ سکوں گی۔ تمھیں اس کے وجوہ معلوم ہیں۔ مگر اس کوٹھی میں رہنا بھی میرے لئے ممکن نہیں۔ میں تم کو اپنے ساتھ ہی رکھتی لیکن مصلحت یہی ہے کہ تم سعد آباد چلی جاؤ جمال کے آجانے کے بعد میں خود چلی آؤں گی یا پھر تم کو بلا لوں گی مجھے اُمید ہے کہ تم اس معاملہ میں ضد نہ کرو گی اور میرے پروگرام میں مخل نہ ہو گی۔"

سانولو کسی طرح جانے کو تیار نہ تھی مگر نسیم نے اپنی ناراضگی کی دھمکی دے کر اس کو آمادہ کر لیا۔ علی الصباح تانگہ بلوا کر سامان بار کرا دیا۔ اور چلتے وقت سانولو کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ دے کر کہنے لگی۔

"اگر ایک ماہ تک میں نہ آؤں یا میرا کوئی خط نہ پہنچے تو اس کو کھول کر پڑھنا اور اس کی تحریر پر عمل کرنا وفادار سانولو روتی ہوئی اور منھ پھیر کر اپنی غم نصیب مالکہ کو دیکھتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

باب ۲۲

انسانوں کا سمندر اُمنڈ رہا تھا۔ جس طرف نگاہ اُٹھتی تھی سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔ بچے۔ بوڑھے۔ مرد۔ عورتیں سر سے کفن باندھ کر وطن کی آزادی کے لئے نکلے تھے۔ مگر ہر ایک کے چہرے پر اُداسی سی ٹپک رہی تھی۔ صدارت کی کرسی دیکھ کر سرفروشوں کو ناکامی کا یقین ہو رہا تھا۔ نو بجے کے قریب رام پرکاش اسٹیج پر آیا اور غمگین لہجہ میں برادران وطن کو ایڈرس کیا۔

بھائیو! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے چہروں پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہیں اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ ہمارا ہر دلعزیز لیڈر جس نے ہمارے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ دشمنوں کی سازش کا شکار ہو گیا۔ مگر ہم کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ایشور نے چاہا تو وہ صحیح و سالم ہم سے ملے گا۔ اور ہماری رہنمائی کرے گا۔ وہ نہیں ہے۔ تو نہ ہو۔ اس کی پیدا کی ہوئی حریت کا جذبہ تو سلامت ہے۔ ہمت نہ ہارنا چاہیئے اور ہمارے ہر فرد کو اس کی مثال بن کر دکھا دینا چاہیئے۔ کہ ایک جمال کیا ہم سب کو گرفتار کر لو تو بھی وطن کے سودائی غلامی کا طوق پہننے کو تیار نہیں

مجھے اسیر کرو یا مری زباں کاٹو
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

ہماری زبانوں پر قفل لگ جائیں۔ ہماری زندگیاں فاقہ کی تکلیف میں ختم

ہو جائیں۔ مگر دست سوال پھیلے گا تو اپنے ہی بھائیوں کے سامنے۔ غیر کی چوکھٹ پر اپنی غیرت مند پیشانی مرتے دم تک جھک نہیں سکتی۔ قلعہ معلی کے پھاٹک پر آج ہماری بھوک ہڑتال کا آغاز ہے۔ گھروں کی چہار دیواری میں مرنے کے عوض مالک کے آستانہ پر جان دینا ہمارا نصب العین ہے۔

رام پرکاش کے بعد عزیز الدین اور دوسرے لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پبلک کا انتشار ان تقریروں سے کچھ کم ضرور ہو گیا مگر تمام مجمع کے جذبات اپنی اصلی حالت پر نہ آسکے۔ آدمی لمحہ بہ لمحہ کم ہوتے گئے۔ اور ذمہ داران کی امکانی روک تھام کے باوجود مجمع چھٹتا رہا۔ عزیز الدین پھر اسٹیج پر آیا اور نہایت دردناک آواز میں گویا ہوا۔

"دوستو! کیا تمہارا جذبۂ آزادی صرف جمال تک محدود تھا۔ ایک اس کے نہ ہونے سے تمہاری قومیت بھی ختم ہو گئی۔"

ابھی وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ ایک برق وش خاتون مجمع کو چیرتی ہوئی اسٹیج پر آئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کی حور شمائل بہمان وطن پرستوں کو خطاب کر رہی ہے

جمال کے ہموطنو!

اگر جمال نہیں تو میں اس کی قائم مقام بن کر تمہاری رہنمائی کروں گی۔ اور زندگی کی آخری سانس تک تمہاری وطنیت کو بلند کرنے میں کوشاں رہوں گی۔ تمہارے دشمنوں کی صف اول کی افراد میں رہنے کے باعث میں بظاہر تم سے کوسوں دور ہوں لیکن جمال کے توسط نے مجھکو تمہاری نسبت تمہارے قلوب سے قریب تر کر دیا ہے۔ تم کو حیرت ہوگی کہ میں پرائے قلب میں چبھنے والے کانٹے کو اپنے

قلب میں چھو کر خوش ہو رہی ہوں۔ مگر یہ دل کی باتیں ہیں۔ دل والا ہی جان سکتا ہے
ابتک میں پس پردہ ہمدرد وغمگسار تھی۔ آج سے سر میدان تمھاری جان نثار ہوں
اور مظلومیت کے مظاہرے میں تمھارے شیدائی کی کنیز بن کر تمھاری ہم نوا ہوں۔

نسیم کے پراثر جملوں نے بجلی کا کام کیا۔ چارسو آگ کے سے شعلے بلند ہونے لگے
"انقلاب زندہ باد"۔ "نسیم اختر زندہ باد" کے نعروں سے در و دیوار ہلنے لگے۔ انقلابیوں
کا مجمع سلاب کی طرح چلا۔ نسیم بھی آگے آگے قلعہ کی طرف بڑھی۔ اُس کے بشرے
سے آہنی عزم۔ اور انداز میں شاہانہ وقار جھلک رہا تھا۔ ہر ہر قدم سے پہاڑوں
کا استقلال اور چہرے سے حسن کا جاہ وجلال آشکار تھا۔

پھاٹک پر وزیراعظم اپنی فوج اور پولیس لیئے غریبوں کی فریاد کا دروازہ
بند کرنے پر آمادہ تھا۔ جاسوسوں کے ذریعہ نسیم کی کارروائی کی خبریں اس کو پہنچ
چکی تھیں۔ عالم اور خورشید نے مجمع میں گھس کر اس کو روکنے کا ارادہ بھی کیا تھا
مگر عاصمہ نے مصلحتاً روک دیا تھا۔ گیارہ بجے کے عمل میں یہ مجمع فوج کے روبرو
آیا۔ وزیراعظم نے عزیزالدین کو مخاطب کیا۔

"عزیزالدین، تم اپنے ساتھ سب کی جانوں کے پیچھے پڑے ہو۔ خیریت اسی
میں ہے کہ پلٹ جاؤ۔ ورنہ لاشیں ابھی پھڑکتی ہوئی دکھائی دیں گی۔"

"ہم جانے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ جائیں گے تو اپنے مطالبات پورے
کرا کے۔" عزیزالدین نے جواب دیا۔

وزیراعظم اس جواب پر اور بھی مشتعل ہوا۔ اور اس نے فوج کو الرٹ ہونے
کا حکم دیدیا۔ پچھلے باب میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جمال نے رضاکاروں کو علی الصباح

تیار رہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ عین اس وقت پہنچا جب فوجیوں کی بندوقیں تن چکی تھیں۔ وزیراعظم جمال اور اس کے ساتھیوں کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔ اور اس نے مشتعل ہو کر فائرنگ کا حکم دیا سیسے کی گولیاں مظلوموں کے سینوں کو چھیدنے لگیں چشم زدن میں زمین خون سے لالہ زار بن گئی۔ بچوں۔ جوانوں اور بوڑھوں کی لاشیں تڑپنے لگیں جمال کے ساتھیوں نے بھی اپنے آلات سنبھال کر حملہ کیا۔ کچھ فوج والے بھی مارے گئے۔ مگر پولیس کی کمک نے علم بردار رضا کاروں کو پسپا کر دیا جمال نسیم کو اپنی آڑ میں لئے بڑھ رہا تھا کہ کسی طرح ظالم وزیر کے پاس پہنچ کر ان سفاکیوں کی بازپرس کرے۔ وزیراعظم بھی غصہ میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے جمال کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ دور ہی سے رائفل کا نشانہ باندھا۔ عاصمہ نے اس کے ارادے کو بھانپ کر بیتابی میں ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ مگر لبلبی دب چکی تھی۔ خطا کار کے نشانہ نے خطا کی گولی سنسناتی ہوئی جمال کے بازو کے قریب سے گذری اور جان نثار نسیم اختر کے سینہ کو چھلنی کر گئی۔ نسیم نے آواز دی

"جمال! مجھے سنبھالو"

جمال نے پلٹ کر دیکھا۔ گرتی ہوئی نسیم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ نسیم نے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر دئیے مگر وہ اس حالت پر قائم نہ رہ سکی۔ جمال مجبور ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ نسیم کا سر اپنے زانو پر اور اپنا منہ اس کے زخموں پر رکھ دیا۔ مگر نسیم نے اس کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ ڈوبتی ہوئی آواز میں اتنا کہا

"پیارے۔ مجھے معاف کرنا" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ جمال پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اس نے اپنا خون بھرا رخسارہ نسیم کے رخسار پر رکھ دیا۔ اور جنون میں

عجب عجب سوالات کرنے لگا۔ مگر اب ہر سوال بے جواب اور ہر شیون لاحاصل تھا۔
نسیم کی موت نے بھاگے ہوئے جوانوں کو غیرت دلائی۔ بے گناہ کے خون سے مقتل کی دنیا منقلب ہوگئی۔ وہی سنگینیں جو مظلوموں کا لہو دیکھ دیکھ کر ہونٹوں پر زبانیں پھیر رہی تھیں۔ ظالم وزیر کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ اس کی بوٹیاں نچ نچ کر فضا میں اچھلنے لگیں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ زمین پر باقی رہ گیا۔ عالم اور خورشید کو لوگوں نے قلعہ کے اندر بھاگتے تو دیکھا مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں روپوش ہوگئے۔ جب نواب عالیجاہ خود آکر رعایا کو عنان حکومت سونپنے کا وعدہ کر چکے اور خون آشام تلواریں وطنی بھائیوں اور اراکین حکومت کا لہو چاٹ کر نیاموں میں پہونچ چکیں تو وہ دونوں بھی نواب عالیجاہ کے سامنے حاضر ہوئے۔
ماہ پارہ نسیم کی لاش ابتک فرش زمین پر پڑی تھی۔ جمال باحال پریشاں حسرت سے اس کو دیکھ رہا تھا آنسو آنکھوں میں خشک ہو چکے تھے۔ عاصمہ بال کھولے ہوئے خاک اُڑا اُڑا کر بین کر رہی تھی۔ اور موت کی آغوش میں سونے والی کے ہونٹوں کو بار بار چوم رہی تھی۔ عزیزالدین نے لاش اُٹھوانے کا انتظام کیا۔ جمال بھی اُٹھا۔ جیب سے ایک تصویر نکالی۔ نسیم کی لاش پر الوداعی نظر ڈالی۔ اور تصویر کو دیکھ کر "پیارے۔ مجھے معاف کرنا" "پیارے۔ مجھے معاف کرنا" کہتا ہوا ایک طرف کو چل نکلا۔ عاصمہ بھی پیچھے پیچھے چلی۔ لوگوں نے ارادہ کیا کہ جمال کو روک کر اپنے ہمراہ لے جائیں۔ مگر عاصمہ کو دیکھ کر سب مطمئن ہوگئے۔ دوسرے دن تک انتظار کیا گیا مگر دونوں میں سے کوئی پلٹ کر نہ آیا۔
نسیم کی لاش سپرد خاک کر دی گئی۔ ناظم اپنے وطن چلا گیا۔ اُس وصیت نامہ

کی رو سے جو نسیم نے چلتے وقت سانولو کو بند لفافہ میں دیا تھا۔ وہ مرحومہ کا وارث نہ ہوسکا سانولو کل املاک کی مالک قرار پائی۔ بلدیو اور بھوانی بھی واپس آئے۔ اور چند مہینے میں مبروص ہو کر لقمۂ اجل ہوئے۔ "گلزارِ یمن" میں مجلس منتظمہ قائم ہو گئی۔ اور نواب عالیجاہ صرف حکومت کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے باقی رہ سکے کرامت حسین اور دیگر بزرگان قوم جو انقلابی جنگ میں کام آئے تھے۔ اُن کے پس ماندگان کے وظائف مقرر ہو گئے۔ ملک کی خوش انتظامی سے گلی کوچوں میں کنچن برسنے لگا۔ دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہو گئے۔ مگر جمال کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ مدتوں کے بعد شہر میں غلغلہ ہوا کہ جنگل کی پہاڑیوں پر ایک جوگی آیا ہوا ہے۔ وہ نہ کسی سے بات کرتا ہے اور نہ کسی کے تقرب کو گوارا کرتا ہے۔ ایک پرانی تصویر اس کے ہاتھ میں ہے اس کو دیکھ کر کبھی کبھی پکار اُٹھتا ہے "پیارے۔ مجھے معاف کرنا" "پیارے۔ مجھے معاف کرنا" ایک نوجوان جوگن بھی اس کے ساتھ ہے۔ مگر جوگی اس سے بھی بہت کم بولتا ہے۔ البتہ اس کی طرف دیکھ کر کسی کسی وقت اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔ نواب عالیجاہ اور خورشید بھی گئے اور جوگن کو جوگی کا ساتھ چھوڑ دینے پر اکسایا۔ مگر عاصمہ اپنے جمال میں کھو چکی تھی۔ اس کی دنیاوی جنت یہی تھیں کہ وہ اس کی خدمت کرتی رہے۔ جب اصرار پابندی کی حد تک بڑھ گیا تو ایک رات وہ جوگی چاہنے والی جوگن کے ساتھ لاپتہ ہو گیا اور آج تک دکھائی نہ دیا۔